ISSN 0974-7346

جون ۲۰۲۲ء

جلد ۲۰۹—عدد ۶

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

سالانہ زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ ۳۵۰ روپے۔ فی شمارہ ۳۰ روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۵۵۴ روپے
دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۷۳۰ روپے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۸۵۰ روپے
ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۵۰۰ روپئے میں دستیاب۔
ہندوستان میں لائف ممبر شپ ۱۵۰۰۰ روپے ہے۔
اشتراک پی ڈی ایف بذریعہ ایمیل (ساری دنیا میں) ۳۵۰ روپے سالانہ
ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ڈاک کا سلسلہ بند ہے۔
اس لئے فی الحال پاکستان معارف کی ترسیل موقوف ہے۔
سالانہ چندہ کی رقم بینک ٹرانسفر، منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔
بینک ٹرانسفر کر کے ہم کو ضرور اطلاع دیں۔ بینک اکاؤنٹ کی تفصیلات یہ ہیں:

Account Name: Darul Musannefin Shibli Academy
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No.: 4761005500000051 - IFSC: PUNB0476100

بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:
Darul Musannefin Shibli Academy, Azamgarh

* زر تعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
* معارف کا زر تعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
* خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
* معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
* کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

Office Mobile: 06386324437
Email: info@shibliacademy.org
Website: http://www.shibliacademy.org

ڈاکٹر فخر الاسلام اعظمی (ڈپٹی ڈائرکٹر) نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۲۰۹ | ماہ ذوالقعدہ ۱۴۴۳ھ مطابق ماہ جون ۲۰۲۲ء | عدد ٦

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹

شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)

پن کوڈ: ۲۷٦۰۰۱

info@shibliacademy.org

شذرات

قریب ڈیڑھ سو سال سے ہندوستان کی سیاست، تہذیب اور حکومت واقتدار کو نگاہ میں رکھ کر ایک خاص مذہبی اور قومی نظریہ کی اشاعت کی جو مسلسل کوششیں جاری تھیں، ان میں کچھ علانیہ تھیں تو بہت کچھ خفیہ و سربستہ تھیں۔ ایک دہائی پہلے ان کوششوں کو منزل مل ہی گئی، جس کے نتیجے میں ملک کے دیگر طبقوں اور حلقوں میں قدرتاً اندیشے بڑھ گئے، لیکن یہ امید بھی تھی کہ قدیم تاریخ جس کی قطعیت و صداقت، تاریخ ہی کے اصولوں سے متنازعہ زیادہ ہے، متفقہ تو ہرگز نہیں، اس کی بنیاد پر اقتدار ملنے کے بعد تاریخ نویسی کے مخصوص پہلوؤں پر نظر ثانی نہ بھی کی جائے تو بھی عملاً اس کے نفاذ سے کنارہ کشی کی جائے گی اور حکومت سنبھالنے کی ذمہ داریاں ان پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کرنے کا مطالبہ کریں گی، جہاں فرقہ واریت، علاقائیت، نسلی عداوت اور مذہبی نفرت و حقارت کا اظہار نہ ہو یا کم سے کم ہو۔ مگر جوں جوں مذہبی تعلیمات میں تحریف اور تاریخ کے چہرہ کو مسخ کرنے کا مزہ بلکہ نشہ بڑھا تو یہ طبقہ بھول گیا کہ ماضی کو یاد کرنے کا مقصد اگر حال کو ناگوار بنا کر برباد کرنا ہے تو یہ کبھی کامیاب عمل نہیں سمجھا گیا۔ جس کا ایک عجیب نمونہ اب پورے ملک کے سامنے ہے، معاشی بربادی، نوجوانوں کی بے روزگاری، زندگی کے لئے نہایت ضروری چیزوں کی روزافزوں گرانی، تعلیم و صحت کی خستہ حالی اور سب سے بڑھ کر بنیادی اخلاقیات کی پامالی اور انسانی مسلمہ اقدار کی بے حرمتی جیسے مسائل کا انبار لگ گیا جن کو حل کرنے کی بجائے ایک بڑی اقلیت کے وجود کو کالعدم بنانے کی پرشور مہم کو ہوا دی گئی، اس سے ملک کے بہی خواہوں کی فکر اور تشویش میں بجا طور پر یہ خیال ابھرنے لگا کہ جمہوری حکومت میں کسی بھی سیاسی جماعت کی اکثریت کو دوسری اقلیتی سیاسی جماعتوں پر زیادہ قوت و اختیار یقیناً حاصل ہوتا ہے لیکن کیا ایک مذہبی اکثریت کو کسی دوسری اقلیت پر زور دکھانے اور اس کے جمہوری و آئینی حقوق سے محروم رکھنے کا بھی حق حاصل ہے؟ یہ خیال یا سوال آج سے نصف صدی پہلے بھی کیا گیا تھا۔ اس وقت سوال کا جو بھی اثر ہوا لیکن آج یہ سوال حاکم و محکوم سے زیادہ ظالم و مظلوم والے پس منظر کی تصویر کشی کرتا ہے۔ ادھر سب سے بڑی اقلیت جو بلاشبہ مسلمان ہیں۔ اس کے لئے جیسے کوئی جور و ستم، باقی نہ رکھنے کے برہنہ اظہار کا ایک بڑا اسٹیج تیار کیا جا چکا ہے۔ بابری مسجد کے ملبہ کا غبار جن چہروں پر غازہ مل گیا اب ان کی ہوس آرائش، دوسروں کے لئے وجہ آزمائش یوں بننے لگی کہ بنارس کی مشہور گیان واپی مسجد کو بھی درجہ شہادت پر فائز کر دینے کی ترغیب اس لئے دی گئی کہ یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ مسخ شدہ تاریخ سے جوڑ کر ہر حقیقت اور ہر سچائی کی تکذیب کے لئے ہتھیار بن جائے، گیان واپی مسجد کو بنانے اور وہاں موجود کسی مندر کو ڈھانے کا شور و غوغا اس طرح بلند کیا جائے کہ سچائی کو منھ چھپانے کی بھی جگہ ملتی نظر نہ آئے۔ ایک دو مہینے سے جمہوریت کے ستونوں کے درمیان ایک ڈرامہ جاری ہے جو ناٹکوں کی عادی

کسی قوم کے لئے تالیوں کا شور پیدا کر سکتا ہے لیکن حق وانصاف کے لئے یہ صرف سر پیٹنے کا مقام ہے۔

*****

اس قسم کی ہر ناانصافی پر اقلیت والے پرانی دستاویزوں کو پیش کرتے اور ان کے ذریعہ دہائی دینے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ لیکن اب وقت سر گوشی کرنے لگا ہے کہ اس سے فائدہ بھی ہے؟ اگر ہم یہ ثبوت کے ساتھ کہیں کہ اورنگ زیب تو وہ تھا جس نے اپنے پوتے شہزادہ بیدار بخت کو ایک معمولی سی غلطی پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ مردانگی کا کمال بے جا گھمنڈ اور اکڑ میں نہیں، بلکہ یہ خود شکنی میں ہے۔

کمال مردمی و مردانگی ست خود شکنی ست

ببوس دست کسے را کہ دیں کمان شکند

تو یہ سنے گا کون؟ ظاہر ہے کہ خود شکنی کی تعلیم دینے والا دوسروں کے جذبات کو مٹی میں ملانے والا ہو ہی نہیں سکتا اور پھر یہ وہی بادشاہ ہے جس نے حاکم بنارس ابوالحسن کو سلطان محمد بہادر کی معرفت یہ پیام یا فرمان بھیجا کہ ''ہماری سچی شریعت اور پاک مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیم مندروں کو گرایا جائے، ہماری اطلاع میں یہ بات آئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اس کے گرد و نواح کے مندروں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور ان کے مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں، لہذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے''۔ یہ فرمان ۲۵ جمادی الاولیٰ ۱۰۶۵ھ کا ہے۔ اس کے علاوہ ان فرمانوں کا تو حساب بھی نہیں لگایا جاسکتا جو مندروں کو دی جانے والی جاگیروں کے تعلق سے ہیں۔ کمال یہ ہے کہ یہ سارے فرمان ہمارے بعض انصاف پسند غیر مسلم مورخین کی تحقیق سے بھی ہمارے سامنے آئے ہیں اور یہ اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایک طرف ریاکار دانشور اور مورخین زہر اور نفرت کی تخم ریزی کرتے رہے تو دوسری طرف وہ بھی دکھائی دیے جو حقائق کو سامنے لاکر انسانیت کی خدمت کو اپنا دھرم مانتے ہیں۔ یہ مورخ غیر مسلم تھے لیکن غیر منصف نہیں تھے۔ انہوں نے آج سے بہت پہلے زمانہ کی نبض پر ہاتھ رکھ کر یوں ہی نہیں کہا تھا کہ ''آخر ہم کب تک تاریخ کو اس کے چوکھٹے سے ہٹا کر آج کی دھول سے اٹے ہوئے آئینہ میں دیکھتے رہیں گے؟ کب تک ہم اپنے من گھڑت افسانوں کو آنے والی نسلوں کے لئے تاریخ کی صورت میں پیش کرکے انسانوں کو جانوروں کی طرح آپس میں لڑاتے رہیں گے؟ انگریز مورخوں کی دسیسہ کاری اپنی جگہ، لیکن کہیں کہیں وہ بھی حق کو دبانے اور چھپانے میں کامیاب نہیں ہو پائے۔ ایک مورخ اونگ ٹن تو شاید بے اختیارانہ لکھ گیا کہ اورنگ زیب عدل کا سمندر تھا۔ پروفیسر آرنلڈ کو عالم گیر کا یہ جملہ بھا گیا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہ دینا چاہیے۔ معاملات تعصب کو تو جگہ مل ہی نہیں سکتی، بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ہی ملیں گی۔

*****

یہ باتیں بھی کہی گئیں، اور شاید ان کو ایک لمحے ہی کے لئے سن بھی لیا گیا، مگر آج وہ ہمت بھی کم ہوتی جاتی ہے جو آئین اور دستور سے قوت پاتی رہی ہے۔ ایسے میں بدکردار سیاست اور اس سے بھی زیادہ بدقماش صحافت فرعون کے جادوگروں کی طرح فرعون کی جے کے نعرے لگانے ہی کے لئے رہ گئی ہے۔ دوسری جانب اردو صحافت میں کالم نگاروں کی کمی نہیں، ان کا قلم لاکھ محتاط ہو لیکن دل کا کرب کب چھپائے چھپتا ہے۔ ان کو بجا طور پر ایک اقلیت ہی کی فکر نہیں، اس ملک کی آزادی اور زندگی کی بھی فکر ہے جو اس راز سے واقف کراتے ہیں۔ آج بھی مشغول ہیں جس کی جانب کبھی علامہ شبلی نے اشارہ کیا تھا کہ "جو واقعات جس قدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہوتی ہے" اس کو فلسفہ تاریخ کا راز بتایا گیا اس راز کو ظاہر کرنے میں یہی مقصد تھا کہ قومیں جوش اقتدار میں جھوٹ کو سچ بنا کر تاریخ کی عدالت کی توہین کی مرتکب نہ ہوں۔

*****

قوموں اور ان کے متکبر اور فساد فی الارض کا ارتکاب کرنے والے رہنماؤں کا نشہ بہر حال ایک حقیقت ہے اسی طرح جس طرح ان کے انجام کی داستانوں میں واقعیت ہے، مگر اس رزم گاہ زندگی میں قوموں کا اپنا احتساب بھی ایک ناگزیر سچ ہے۔ وہ قوم اپنا تحفظ کر ہی نہیں سکتی جس کے پاس کوئی قائد نہ ہو۔ یہ قائد اور راہنما، خود قوموں کے حوصلوں اور ان کے مزاج سے بنتا ہے، خود ساختہ قائد کبھی قوم کی ساخت و پرداخت کے اہل نہیں ہو سکتے، اکثریت کی قیادت سے کہیں زیادہ اقلیت کی قیادت کے لئے نگاہ کی بلندی، حقیقتوں کی یافت، مسائل کے اسباب کا ادراک اور سب سے بڑھ کر ایثار اور ہر قسم کی قربانی کی ضرورت ہے۔ آج جس مقام پر ایک پوری ملت کھڑی ہے وہاں حد نگاہ تک بس غبار ہی غبار ہے۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب مستقبل کے مورخ کے ذمہ تو ہے ہی ہماری موجودہ قیادت کو بھی جواب دہ ہونا ہے۔ شاید اس عمل میں یہ شعر قوم کی زبان پر آجائے کہ:

ہم اپنے رہزن و رہبر تھے لیکن سادہ لوحی سے
کسی کو راہزن سمجھے کسی کو راہبر جانا

*****

ناظم دارالمصنّفین اور مدیر معارف ڈاکٹر ظفر الاسلام خاں ہفتہ عشرہ کے لئے ترکی اور قطر کے دورے پر ہیں۔ خدا کرے یہ سفر واقعی وسیلۂ ظفر ثابت ہو۔

*****

مشکلات السیرۃ

ڈاکٹر سید عزیز الرحمن

انچارج، ریجنل دعوۃ سینٹر سندھ کراچی

دعوہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان

syed.azizurrahman@iiu.edu.pk

سیرتِ طیبہ فنی طور پر مرتب، مدون دوسرے فنون سے مختلف ہے، جو اپنے حدود و قیود اور تعریف کے لحاظ سے اور اطلاقات و مشمولات اور اپنے متعلقات کی وجہ سے دوسروں سے مکمل طور پر منفرد اور ممتاز ہے۔ اس کا ایک سبب علمائے سیرت کی وہ کاوشیں ہیں جو چودہ سو برس سے مسلسل جاری ہیں۔ دیکھا جائے تو سیرتِ طیبہ پر جو کچھ لکھا گیا، جس جہت سے لکھا گیا اور جو تنوع پیش کیا گیا اور حیاتِ مبارکہ کے ہر ممکنہ پہلو کو جس طرح محفوظ کیا گیا، یہ بہ جائے خود اعجاز سیرت ہے اور اعجازِ صاحب سیرت ہے، صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔

یہ بھی اعجازِ سیرت ہے کہ نئے نئے حوالوں سے کام کی گنجائش اور ضرورت تواتر کے ساتھ سامنے آتی رہتی ہے اور یہ پیغام دیتی رہتی ہے کہ یہ موضوع اور اس کے حدود غیر مختتم ہیں، اس حوالے سے کاوشوں کا سلسلہ تا قیامِ قیامت جاری رہے گا۔ اس ضمن میں فن سیرت نگاری میں جن پہلوؤں سے خصوصی دل چسپی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ان میں اصولِ سیرت نگاری اور مشکلات السیرۃ شامل ہیں، بلکہ سر فہرست ہیں۔ فن مشکلات السیرۃ کیا ہے؟ اس کی ضرورت اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ اس فن کے حدود کیا ہو سکتے ہیں؟ اور اس کو منضبط کرنے کے لیے کیا کیا اصول پیش نظر رہنے چاہییں۔ اس حوالے سے یہ تحریر ایک مبتدیانہ کاوش کا درجہ رکھتی ہے، جس میں اس فن شریف کے ابتدائی خد و خال واضح کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

مشکلات السیرۃ پر بات کرنے سے قبل ضروری ہے کہ مشکلات الحدیث پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے، کیوں کہ منبع اور مصدر کے اعتبار سے فن سیرت بھی ابتدائی طور پر فن حدیث کی ہی ایک شاخ ہے، جس نے اہل سیر کی کاوشوں کے نتیجے میں ابتدا ہی میں اپنی الگ شناخت اور پہچان اختیار کر لی تھی۔

حدیث میں اس حوالے سے دو اہم عنوانات اختیار کیے جاتے ہیں، ایک ہے مختلف الحدیث اور دوسرا ہے مشکل الحدیث۔ علم حدیث میں ان دونوں عنوانات کے تحت کتب بھی موجود ہیں۔

چنانچہ مختلف الحدیث کے مفہوم کی وضاحت کے لیے ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ تعریف کی ہے:

الحديث الذي عارضه ظاهرا مثله.[۱] (ایسی حدیث جس کے معارض دوسری اس جیسی حدیث موجود ہو)۔

اور علامہ سیوطی نے یہ تعریف بیان کی ہے: أن ياتي حديثان متضادان في المعنى ظاهرا.[۲] (ایسی دو احادیث کا پایا جانا، جن کے معنی میں ظاہراً تضاد ہو)۔

جب کہ مشکل الحدیث کی تعریف میں اصولین اور محدثین میں بھی اختلاف ہے، اصولین یہ تعریف کرتے ہیں:

هو اللفظ أو الكلام الذي خفي المراد به على السامع وكان خفاؤه لأجل الصيغة ولا يدرك إلا بالعقل.[۳] (ایسا لفظ یا کلام جس کی مراد سامع پر واضح نہ ہو سکے اور اس کا سبب الفاظ ہوں، جسے صرف عقل کے ذریعے ہی جانا جا سکے)۔

اور محدثین اس کی تعریف یوں کرتے ہیں: المشكل هو الذي يحتاج في فهم المراد به إلى تفكر وتأمل.[۴] (مشکل اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی مراد غور و فکر کے بغیر سمجھ میں نہ آسکے)۔

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر وہ بات جو کسی الجھن کا باعث بنے وہ فنی طور پر ''مشکل'' کہلائے گی۔ وہ کوئی لفظ بھی ہو سکتا ہے، کوئی جملہ یا عبارت بھی ہو سکتی ہے اور کوئی واقعہ بھی۔ ان مشکلات یا الجھنوں کا تعلق جب سیرتِ طیبہ سے ہو گا تو انہیں مشکلات السیرۃ کا عنوان دیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ اس تفصیل کی روشنی میں مشکلات السیرۃ کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

وہ تمام الجھنیں، جو کسی لفظ جملے یا عبارت، یا کسی واقعے سے پیدا ہوں، یا جن واقعاتِ سیرت کی تفہیم میں روایتاً یا درایتاً دقتیں پیش آئیں، انہیں مشکلات السیرۃ کہتے ہیں۔

علوم اسلامی میں خاص طور پر مشکلات القرآن اور مشکلات الحدیث پر خاصا کام موجود ہے، مگر یہ معاملہ محض ان دو علوم و فنون تک محدود نہیں، کم و بیش ہر فن میں اس نوعیت کے مسائل موجود ہیں، جو مشکل کے ذیل میں آسکتے ہیں، بعض جگہوں پر، کچھ علوم و فنون میں انہیں الگ سے مدون کر دیا گیا ہے، بہت سی جگہوں پر

---

[۱] ابن حجر۔ شرح نخبۃ الفکر۔ مکتبۃ الغزالی، دمشق: ص ۲۰

[۲] سیوطی۔ تدریب الراوی۔ دار النشر الکتب الاسلامیہ، لاہور: ص ۹۱۱

[۳] جرجانی۔ التعریفات۔ بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۳ھ: ص ۲۱۸۔ عزالدین عبد اللطیف۔ شرح المنار۔ مصر، دار سعادات ۱۳۱۵ھ: ج ۱، ص ۳۱۳

[۴] حامد محمود، ڈاکٹر۔ القاموس القویم فی اصطلاحات الاصولیین۔ قاہرہ، دار الحدیث ۱۹۹۲ء: ص ۲۳۵

ایسا نہیں ہے، اس لیے اس عنوان سے کوئی گوشۂ علم یا نوع متعارف نہ ہو سکی۔ فنِ سیرت کے حوالے سے مشکلات السیرۃ کی بھی یہی کیفیت ہے، ورنہ مختلف کتب کے ضمن میں ایسی بحثیں موجود ہیں، جنہیں مشکل السیرۃ کہا جا سکتا ہے، اور اہلِ علم ان سے اعتنا بھی کرتے رہتے ہیں۔

مشکل السیرۃ کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ اس نوعیت کی مشکلات فن میں کیفیت اور کمیت کو بھی دخل ہوتا ہے اور اس کے اعتبار سے بھی مشکل کی حیثیت تبدیل ہوتی رہتی ہے، جس میں خاص طور پر قاری کی ذہنی سطح اور اس فن سے وابستگی کا دخل بھی ہوتا ہے، اسی اعتبار سے لفظ مشکل میں بھی اختلاف اور تنوع فکر کی گنجائش ہے، کیوں کہ کسی بھی علم و فن کی مشکلات کو کسی ایک نوع یا قسم میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر فرد کے اعتبار سے الجھن اور مشکل کی سطح مختلف ہوتی ہے، مثلاً ایک ماہر لغت کے لیے کسی نوع کی لغوی الجھن کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہی حال دوسرے شعبوں کا ہے، یعنی اگر فنِ سیرت میں کوئی روایت محض اپنے اختصار کی وجہ سے ابہام رکھتی ہے اور وہ ابہام کسی الجھن کا باعث ہے تو وہ کسی بھی ایسے فرد کے لیے الجھن کا باعث نہیں ہو سکتا، جو اس نوع کی دوسری روایاتِ سیرت سے واقفیت رکھتا ہے۔ اسی طرح کسی کے سامنے اگر کسی واقعے کا پسِ منظر موجود ہے، یا اس کا درست محل واضح ہے، تب بھی اس کے لیے واقعے کو درست تناظر میں دیکھنا ممکن ہے، جو کسی ایسے فرد کے لیے ممکن نہیں جو اس تفصیل سے آگاہ نہیں ہے، اس کے لیے وہ واقعہ الجھن کا باعث قرار پائے گا۔

بعض جگہوں پر کسی واقعے کی نقل میں عدمِ احتیاط کے سبب واقعہ ہی متعدد بار فرض کر لیا جاتا ہے، جب کہ اصل قصہ ایک ہی بار پیش آیا ہوتا ہے، یہ بھی الجھن کا باعث ہوتا ہے اور اس کا ازالہ بھی اصل حقیقت سے واقفیت کی صورت میں ممکن ہے، ان تمام امور کو پیش نظر رکھا جائے تو مشکلات السیرۃ کی اہمیت اور اس کی حقیقت سے کسی قدر آگہی ممکن ہے۔

ہم اس ضمن میں کوشش کریں گے کہ مشکلات السیرۃ کے درست محل اور تعریف کو متعین کرنے کے بعد اس ضمن میں ایسے اصول بھی طے کر سکیں جو رفعِ مشکل میں مفید ہو سکیں اور بیانِ سیرت میں ان اصولوں سے استفادہ کر کے مشکلات اور الجھنیں کم کی جا سکیں۔

مشکلات کی صورتیں اور ان کا حل

فنِ سیرت میں پیش آنے والی مشکلات عام طور پر بیان سے تعلق رکھتی ہیں، مگر ان میں بہت سے پہلو مل جاتے ہیں۔ ہم ذیل میں اس حوالے سے چند نکات عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔

ا۔ حدیث میں یہ اصول طے شدہ ہے، اگرچہ اس کے اطلاق پر بحث ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے کہ کوئی

روایت مقامِ نبوت کے منافی ہو تو قبول نہیں کی جائے گی۔ یہ بات اصلاً تو اصولِ سیرت کا حصہ ہے، مگر اسے مشکلات السیرہ میں بھی شامل کیا جانا چاہیے کہ اس اصول کے پیشِ نظر نہ رکھنے کے سبب بھی بہت سے مغالطے پیدا ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ کئی روایات کا انکار محض اسی بنیاد پر کیا گیا ہے، جس کی مثالیں ادب سیرت میں کثرت سے دست یاب ہیں، مگر اس کے لیے کسی واضح دلیل کا ہونا ضروری ہے، محض ذوق پر کسی تسلیم شدہ مستند یا ثابت شدہ روایت کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ بسا اوقات ایک روایت کسی خاص پسِ منظر سے تعلق رکھتی ہے، پس منظر سے عدم واقفیت واقعے کی تفہیم میں مشکل کو جنم دیتی ہے۔ اس واقعے کی درست حقیقت سے واقفیت کے لیے اس پسِ منظر کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ روایت کا پس منظر جاننے کے بعد اس مشکل کو حل کرنا بہت سہل ہو جاتا ہے، اگر متعلقہ واقعے کی تمام اہم روایات ممکنہ دست یاب مصادر سے یک جا کر کے پیشِ نظر رکھ لی جائیں، تو اصل صورتِ حال واضح ہو سکتی ہے اور اشکال رفع ہو سکتا ہے۔

۳۔ جمعِ طریق/طرق، کئی مقامات پر پیدا ہونے والی الجھن اور مشکل محض روایات کو جمع کر لینے سے رفع ہو جاتی ہے، ایسی بہت سی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں اور اس مضمون میں بھی ہم چند مثالیں پیش کر رہے ہیں۔

۴۔ روایات کی درجہ بندی۔ روایات کے تعدد کی صورت میں، جب کہ وہ روایات باہم متعارض ہوں اور ان کے مابین جمع کی صورت بھی ممکن نہ ہو تو ترجیح کے ضابطے سے فیصلہ کرنا ممکن ہوتا ہے۔ اس کے لیے روایات کی درجہ بندی، مصادر کی حیثیت اور راوی کا مقام بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔

۵۔ درایت۔ کئی مواقع پر روایتی اعتبار سے واقعہ درست ہونے کے باوجود درایتاً اور خالص عقلی اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں درایت کو ہی ترجیح ہوگی اور اس ضابطے کے تحت روایت کے بارے میں فیصلہ کرنا ممکن ہوگا۔

۶۔ کسی بھی روایت کا قرآن کے کسی بیان کے برعکس، برخلاف یا بہ ظاہر متعارض ہونا بھی ترکِ روایت کا سبب ہوگا، ایسی صورت میں روایت کو ترک کر کے اس مشکل کو حل کیا جائے گا۔

۷۔ بعض جگہ روایات کے جمع سے بھی مشکلات پیش آتی ہیں اور ایک واقعہ متعدد بار تصور کر لیا جاتا ہے، جب کہ حقیقت میں وہ ایک ہی واقعہ ہوتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ واقعے کی حقیقت کو درایتاً پرکھتے ہوئے اس کا مقام متعین کیا جائے، اور جمعِ روایت کے نتائج کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کیا جائے۔

مشکلات السیرہ: چند مباحث

ذیل میں ہم اس تفصیل کی روشنی میں چند مثالیں رسول اللہ ﷺ کے مکی عہد سے پیش کرتے ہیں، جن کی روشنی میں ہمارے لیے ان اصول اور ضوابط کی درست تفہیم بھی ممکن ہوگی اور اس فن کے مباحث کا دائرہ،

ضابطہ اور اس کے تقاضے بھی زیادہ واضح ہو سکیں گے۔ واللہ ہو الموفق

شقِّ صدر

معجزات کے باب میں شقِ صدر کا واقعہ اہتمام سے بیان ہوتا ہے، اس حوالے سے کئی روایات موجود ہیں۔ ہم ابتدا میں ان تمام مواقع اور ان سے متعلق اہم روایات کا جائزہ لیتے ہیں، پھر اس ضمن میں پیش آمدہ مشکلات پر بات کریں گے۔

سیرت لٹریچر کا استقصا بتاتا ہے کہ حیات نبوی ﷺ میں شقِ صدر کا واقعہ پانچ بار بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ پہلا واقعہ عہد رضاعت کا ہے، جو اس طرح بیان ہوتا ہے کہ آپ ﷺ اپنے رضاعی بھائیوں کے ہم راہ بکریاں چرا رہے تھے کہ اچانک آپ کا ایک رضاعی بھائی دوڑتا ہوا آیا اور اس نے بتایا کہ دو سفید پوش آدمی آئے اور ہمارے قریشی بھائی کو زمین پر لٹا کر ان کا شکم مبارک چاک کیا، اب اس کو سی رہے ہیں۔ یہ واقعہ سنتے ہی حلیمہ اور ان کے شوہر دوڑتے ہوئے اس جگہ پہنچے تو دیکھا کہ آپ ﷺ ایک جگہ کھڑے ہوئے ہیں اور چہرۂ انور کا رنگ اترا ہوا ہے۔ حلیمہ کہتی ہیں کہ میں نے فوراً آپ کو سینے سے چمٹا لیا، پھر آپ سے پوچھا کہ کیا ہوا تھا۔ آپ ﷺ نے واقعہ بیان فرما دیا۔ حلیمہ آپ کو لے کر گھر واپس آ گئیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس وقت آپ کی عمر مبارک چار برس تھی۔ یہ واقعہ متعدد روایات میں مختلف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔[۵]

۲۔ روایات کے مطابق شق صدر کا واقعہ دوسری بار اس وقت پیش آیا، جب آپ ﷺ کی عمر مبارک دس سال کی تھی۔[۶] علامہ زرقانی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ یہ روایت مستند ہے، اس کے راوی ثقہ ہیں۔[۷]

---

[۵] ۔ اس روایت کے لیے دیکھیے: المستدرک۔ ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ حاکم النیسابوری۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اول ۱۹۹۰: ج ۲، ص ۶۷۳، رقم ۴۲۳۰/۲۴۰۔ زرقانی علی مواہب اللدنیہ۔ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الباقی۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۱، ص ۱۶۰۔ ابن ہشام۔ السیرۃ النبویہ۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء: ج ۱، ص ۱۸۷۔ عن ابن اسحاق۔ عیون الاثر۔ ابو الفتح محمد بن محمد بن سید الناس۔ مکتبہ دار التراث، مدینہ منورہ ۱۹۹۲ء: ج ۱، ص ۹۴۔ ہیثمی، مجمع الزوائد۔ دار الکتب العلمیہ، ۲۰۰۹ء: ج ۸، ص ۲۸۸، رقم ۱۳۹۴۱

[۶] ۔ ملاحظہ ہو: فتح الباری۔ ابن الحجر العسقلانی۔ قدیم کتب خانہ کراچی: ج ۱۳، ص ۵۸۴ باب ما جاء فی قولہ عز و جل و کلم اللہ موسیٰ تکلیما

[۷] ۔ زرقانی: ج ۱، ص ۱۸۳

۳۔ تیسری بار یہ واقعہ بعثت کے وقت پیش آیا، جیسا کہ مسند ابی داؤد طیالسی[۸] اور دلائل ابی نعیم[۹] میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔[۱۰]

۴۔ یہ واقعہ معراج کے وقت پیش آیا جیسا کہ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی وغیرہ میں ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور اس بارے میں روایتیں تواتر اور مشہور ہیں۔[۱۱]

۵۔ علامہ شامی بیان کرتے ہیں چار بار شقِ صدر ہوا، لیکن انہوں نے ۲۰ سال کی عمر میں بھی شقِ صدر کا ذکر کیا ہے۔[۱۲] اس طرح مجموعی طور پر یہ واقعہ کتب سیرت وحدیث میں پانچ بار بیان ہوتا ہے۔

بعض حضرات نے اس واقعے کو تین بار بیان کیا ہے۔ چناں چہ ابن حجر کا رجحان اسی طرف ہے۔ وہ اپنے مزاج کے مطابق روایات میں تطبیق بھی دیتے ہیں اور تینوں بار شق صدر کی الگ الگ حکمتیں بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ شقِ صدر کا واقعہ تین مواقع پر ذکر کیا جاتا ہے، ایک بچپن میں جب آپ ﷺ

۸۔ ابوداؤد الطیالسی۔ المسند۔ بیروت: ص ۲۱۵

۹۔ ابونعیم۔ دلائل النبوۃ۔ بیروت: ج ۱، ص ۶۹

۱۰۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت جو دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے اس کی سند میں دو راوی متکلم فیہ ہیں ایک یزید بن بانبوس ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ یزید بن بانبوس مجہول ہے، لیکن دار قطنی فرماتے ہیں لا باس بہ اس میں کچھ حرج نہیں یعنی اچھا خاصا راوی ہے اور ابن حبان نے اس کو ثقات میں ذکر کیا ہے۔ تہذیب ج ۱۱، ص ۳۱۶، حافظ مزّی تہذیب الکمال میں فرماتے ہیں کہ ذکرہ ابن حبان فی الثقات و روی لہ البخاری فی الادب وابوداؤد والترمذی فی الشمائل والنسائی اور تہذیب الکمال: ج ۷، ص ۲۲۱ دوسرا راوی داؤد بن المجر ہے جس کو بعض علمانے کذاب بتلایا ہے، لیکن یحییٰ بن معین فرماتے ہیں ثقہ ہے کذاب نہیں، ابوداؤد فرماتے ہیں ثقہ ہے لیکن مشابہ ضعیف کے ہے نسائی فرماتے ہیں ضعیف ہے تہذیب ص ۱۹۹، ۳۷۰۔ بہ ہر حال اس حدیث کی سند لا باس بہ سے کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتی خصوصاً جب کہ ابو داؤد طیالسی کی سند کو بھی اس کے ساتھ ملا لیا جائے تو اور قوت آجاتی ہے اسی وجہ سے حافظ ابن ملقن اور حافظ عسقلانی نے اس کو ثبت کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔ حافظ ابن ملقن کے یہ الفاظ ہیں و ثبت شق الصدر ایضاً عند البعثۃ کما اخرجہ ابو نعیم فی الدلائل اور شرح بخاری ج ۷، ص ۳۸۷، اور عسقلانی کے الفاظ بھی اسی کے قریب بلکہ یہی ہیں۔ (نیز اس واقعے کا بہ وقت بعثت پیش آنا مسند بزار میں ابوذر غفاری سے مروی ہے۔ علامہ ہیثمی فرماتے ہیں کہ ابوذر کی یہ حدیث اس حدیث کے مغائر ہے جو ابوذر ہی سے در بارہ اسراء و معراج صحیح بخاری میں مذکور ہے۔ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں اور بخاری کے راوی ہیں مگر جعفر بن عبد اللہ بن عثمان الکبیر جس کی ابو حاتم رازی اور ابن حبان نے توثیق کی ہے اور عقیلی نے اس میں کلام کیا ہے۔ (کاندھلوی، محمد ادریس، مولانا۔ سیرت مصطفی: ج ۱، ص ۷۳۔۷۸)

۱۱۔ ابن حجر نے متعدد روایات ذکر کی ہیں۔ ملاحظہ ہو: فتح الباری: ج ۷۹، ص ۲۵۹

۱۲۔ شامی، محمد بن یوسف، سبل الہدیٰ والرشاد (سیرت شامی)۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۱۹۹۳ء: ج ۲، ص ۶۰

بنی سعد میں پرورش پا رہے تھے، دوسری بار بعثت کے وقت اور تیسری مرتبہ معراج میں البتہ، بعض حضرات نے معراج کے موقع پر شق صدر کا انکار کیا ہے، مگر اس کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ اس بارے میں روایات تواتر کے ساتھ ہیں اور صحیح یہی ہے کہ یہ واقعہ تینوں موقعوں پر پیش آیا اور ہر موقع پر الگ الگ حکمتیں تھیں، بچپن میں آپ ﷺ کو شیطان کے اثرات سے مکمل طور پر محفوظ رکھنے کے لیے شق صدر ہوا، جیسا کہ مسلم کی روایت میں ہے کہ ایک ٹکڑا نکال کر فرشتے نے کہا کہ یہ شیطان کا حصہ تھا جو نکال دیا گیا، بعثت کے وقت وحی کی عظیم الشان نعمت کے تحمل کے لیے دل کو قوت دینے کی غرض سے شقِ صدر ہوا اور تیسری بار معراج میں آپ ﷺ کے قلبِ اطہر کو ایمان و حکمت بہ تمام و کمال عطا کرنے اور ہر طرح کا فضل مکمل طور پر عطا کرنے کے لیے شقِ صدر ہوا۔[13]

علامہ سید سلیمان ندوی شقِ صدر کے دو بار ہونے کے قائل ہیں۔ وہ معجزات کی بحث میں شق صدر کی تمام روایات پر سنداً، متناً اور کہیں کہیں درایتاً نقد کے بعد فرماتے ہیں کہ اس تشریح اور تفصیل کے بعد بھی اگر کسی کو حماد کی اس روایت (جو بچپن میں شق صدر کو بیان کرتی ہے) کے قبول کرنے پر اصرار ہو تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت کے مطابق بچپن میں جب عقل و ہوش کا آغاز ہوا تو سینۂ مبارک سے حصۂ شیطانی جو ہر انسان کے اندر ہے اس کو نکالا گیا کہ صحیح مسلم کی اس روایت میں اسی قدر ہے۔ ابھی علم و حکمت کی کوئی چیز رکھی نہیں گئی، مگر معراج کی رات جب اس عقل و ہوش کی تکمیل ہوئی تو وہ دھو کر علم و حکمت سے معمور کیا گیا۔ جیسا کہ تمام روایتوں میں ہے۔[14] مولانا کاندھلوی صاحب کا ذوق بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام روایات کو درست نہیں سمجھتے۔ چنانچہ انہوں نے دو برس کی عمر میں ہونے والے شقِ صدر کا انکار کیا ہے۔[15] اس بحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں جس قدر بھی روایات ہیں اور جس قدر بھی تعدد واقعہ محسوس ہوتا ہے، وہ سب کا سب کسی بھی سیرت نگار کے ہاں مقبول نہیں، نہ یہ تعدد درست ہے، اس لیے کوئی چار بار، کوئی تین بار اور کوئی صرف دو بار کا قائل ہے، لیکن محض درایت کو پیش نظر رکھیں تو دو بار کا تعدد بھی باور کرنا مشکل نظر آتا ہے، اس لیے کہ جو کام ایک بار سے ممکن تھا، اس کے لیے بار بار یہ عمل دہرانا غیر منطقی ہے، اگرچہ سید سلیمان ندوی نے اس کی حکمت بیان کی ہے تاہم اس موقع پر قاضی عیاض کی رائے اور بحث توجہ چاہتی ہے۔ ان کے خیال میں واقعۂ شق صدر ایک ہی بار عہد رضاعت ہی میں پیش آیا ہے۔[16]

---

[13] ۔ ابن حجر۔ فتح الباری: ج ۷، ص ۲۵۹

[14] ۔ ندوی، سید سلیمان، سیرۃ النبی، دار الاشاعت، کراچی، ج ۳، ص ۲۷۶

[15] ۔ ملاحظہ ہو حوالہ سابق، مولانا کاندھلوی

[16] ۔ قاضی عیاض، الشفا۔ دار الکتب العلمیہ، بیروت، ۲۰۰۲ء: ج ۱، ص ۱۱۶

عہد حاضر کے اہم محقق سیرت ڈاکٹر محمد یاسین مظہر صدیقی قاضی عیاض کی ہی روایت کو ترجیح دیتے ہیں، اور اس بات کے قائل ہیں کہ یہ واقعہ ایک ہی بار پیش آیا ہے۔[۱۷]

اس بحث سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اغلباً جمع روایات کے ذوق کے سبب یہ تعدد ظہور پذیر ہوا، ورنہ فی الحقیقت یہ واقعہ ایک ہی بار بچپن میں پیش آیا ہے۔ اس ضمن میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ معراج کے موقع پر واقعۂ شرح صدر/شق صدر کی روایات مسند ترین ہیں۔ جن کی کوئی توجیہ سر دست نہیں کی جاسکتی۔ واللہ اعلم

اس سلسلے میں ایک اہم نکتہ جو اگرچہ بہ راہ راست موضوع سے متعلق نہیں، لیکن زیر بحث واقعے کے حوالے سے اہم ہے، وہ سید سلیمان ندوی کی رائے ہے، وہ شق صدر کی بہ جائے شرح صدر کی ترکیب کو زیادہ مفید، بامعنی اور بہتر قرار دیتے ہیں۔[۱۸]

قصہ بحیرۂ راہب

مشکلات السیرۃ کے حوالے سے ایک اہم موضوع بحیرۂ راہب کا ہے۔ یہ واقعہ ابن اسحاق کے بہ قول اس وقت پیش آیا، جب آپ ﷺ کی عمر مبارک تقریباً بارہ سال تھی۔ آپ کے چچا ابو طالب نے حسبِ روایت شام کا سفر کیا۔ رسول اللہ ﷺ بھی ساتھ تھے۔ یہ تجارتی قافلہ شام کے شہر بصرہ سے باہر ایک عیسائی راہب کی خانقاہ کے قریب اترا۔ اس کا اصل نام جرجیس تھا اور وہ بحیرا کے نام سے معروف تھا۔ آخری نبی کے حوالے سے جو علامتیں آسمانی کتابوں میں نقل ہوتی چلی آرہی تھیں یہ ان سب سے خوب واقف تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ وہی نبی ہیں جن کی علامتیں آسمانی کتابوں میں موجود ہیں۔[۱۹]

دوسری جانب ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار ابو طالب قریش کے ساتھ شام کی طرف گئے۔ شام میں جس جگہ جاکر قیام کیا وہاں ایک راہب رہتا تھا۔ اس سے پہلے بھی یہاں سے گزر ہوتا تھا مگر اس راہب نے کبھی توجہ نہ کی۔ اس دفعہ جب قریش کا قافلہ وہاں جاکر اترا تو یہ راہب خلاف معمول اپنی خانقاہ سے نکل کر قافلے والوں کے پاس آیا اور اہلِ قافلہ میں سے ایک ایک کو غور سے دیکھنے لگا، حتیٰ کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا کہ یہی تمام جہانوں کا سردار ہے، یہی اللہ کا رسول ﷺ ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گا۔

---

[۱۷] ۔ صدیقی، محمد یاسین مظہر، خطبات سیرت۔ ادارہ تحقیقات اسلامی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۱۷ء: حاشیہ ص ۱۶۵

[۱۸] ۔ سیرت النبی: ج ۳، ص ۲۷۶

[۱۹] ۔ ابن ہشام: ج ۱، ص ۲۰۵

اہلِ قافلہ میں موجود قریش کے سرداروں نے راہب سے پوچھا کہ تمہیں کیسے معلوم ہوا۔اس نے کہا کہ جس وقت تم سب لوگ گھاٹی سے نکلے تو کوئی درخت اور پتھر ایسا باقی نہ رہا جس نے ان کو سجدہ نہ کیا ہو، درخت اور پتھر صرف نبی کو سجدہ کرتے ہیں۔ نیز میں تو انہیں مہرِ نبوت سے بھی پہچانتا ہوں، جو آپ ﷺ کے شانے کے نیچے سیب کے مشابہ ہے۔ پھر راہب واپس چلا گیا،اس نے تمام قافلے والوں کے لیے کھانا تیار کرایا، کھانے کے لیے سب حاضر ہوئے تو آپ ﷺ موجود نہ تھے، راہب کے دریافت کرنے پر اس کو بتایا گیا کہ آپ اونٹ چرانے گئے ہیں۔ آدمی بھیج کر آپ کو بلایا گیا۔ آپ جب تشریف لائے تو ایک ابر آپ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ لوگ آپ کے پہنچنے سے پہلے ہی درخت کے سائے میں جگہ لے چکے تھے۔ لہٰذا آپ ایک جانب بیٹھ گئے۔ آپ کے بیٹھتے ہی درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک گیا۔ راہب نے کہا کہ درخت کے سائے کو دیکھو کہ کس طرح آپ کی طرف مائل ہے۔اور پھر کھڑے ہو کر لوگوں کو قسمیں دینے لگا اور کہا کہ آپ لوگ ان کو روم کی طرف نہ لے جائیں، رومی آپ کی صفات اور علامات دیکھ کر آپ کو پہچان لیں گے اور قتل کر ڈالیں گے۔ اسی دوران راہب نے دیکھا کہ چند رومی باشندے کچھ تلاش کرتے ہوئے اس طرف آرہے ہیں، راہب نے ان سے پوچھا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم اس نبی کی تلاش میں آئے ہیں جس کے بارے میں توریت اور انجیل میں خبر دی گئی ہے؟ وہ اس مہینے میں سفر کے لیے نکلنے والا ہے۔ جب ہمیں تم لوگوں کا علم ہوا تو ہمیں اس طرف بھیج دیا گیا، راہب بولا: یہ تو بتاؤ کہ کسی بات کا اللہ تعالی نے اگر ارادہ فرما لیا تو کیا کوئی اس کو روکنے کی طاقت رکھتا ہے؟ رومیوں نے جواب دیا نہیں، راہب نے رومیوں سے کہا کہ پھر تم ان کے ہاتھ پر بیعت کرو اور ان کے ساتھ رہو۔

راہب نے پھر قریش کے قافلے کو قسم دے کر دریافت کیا کہ تم میں سے اس کا سرپرست کون ہے۔ لوگوں نے بتایا کہ ابو طالب ہیں۔ راہب نے ان سے کہا کہ آپ ان کو فوراً واپس بھیج دیں۔ چنانچہ ابو طالب نے آپ ﷺ کو مکہ واپس بھیج دیا۔ راہب نے زادِ سفر کے طور پر روٹی اور زیتون کا تیل ساتھ دیا۔[۲۰] حافظ ابن حجرؒ الاصابہ میں لکھتے ہیں کہ اس روایت کے تمام راوی ثقہ ہیں، اسے بزارؒ نے بھی اپنی مسند میں ذکر کیا ہے۔[۲۱] یہ واقعہ تقریباً تمام اہم اور کم اہم سیرت نگار بیان کرتے ہیں۔[۲۲]

۲۰۔ ترمذی، الجامع السنن۔ دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۴ء: ج۵، ص۳۵۷، رقم ۳۶۴۰

۲۱۔ حاشیہ زاد المعاد، ابن قیم جوزیہ۔ مکتبہ المنار الاسلامیہ، کویت، ۱۹۸۷ء: ج۱، ص۷۶

۲۲۔ ملاحظہ کیجیے: ابن ابی شیبہ، کتاب مغازی۔ دار اشبیلیا، بیروت ۱۹۹۹ء: ص۹۱، رقم ۷۔ ترمذی۔ زاد المعاد: ج۱، ص ۷۶۔ ابن حبان، السیرۃ النبویہ واخبار الخلفا۔ موسسۃ الثقافیہ، بیروت ۱۹۹۷ء: ص۵۸۔ المستدرک: ج۲، ص۶۷۳، رقم ۴۴۲۹/۲۳۹۔ عام طور پر اس روایت پر یہی کہا جاتا ہے کہ یہ روایت سنداً درست ہے، البتہ ابو بکر اور بلال رضی اللہ عنہما

یہ واقعہ کئی اہل تحقیق سیرت نگاروں کے ہاں درایتی اعتبار سے محلِ نظر رہا ہے، علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ اس روایت سے جس قدر شغف عام مسلمانوں کو ہے اس سے زیادہ عیسائیوں کو ہے۔ سر ولیم میور، ڈریپر، مارگیولوس وغیرہ سب اس واقعے کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مذہب کے حقائق واسرار اسی راہب سے سیکھے اور جو نکتے اس نے بتا دیے تھے، ان ہی پر آنحضرت ﷺ نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی۔ اسلام کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروح اور حواشی ہیں۔

عیسائی مصنفین اگر اس روایت کو صحیح مانتے ہیں تو اس طرح ماننا چاہیے جس طرح روایت میں مذکور ہے۔ اس میں بحیرا کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں۔ قیاس میں بھی نہیں آسکتا کہ دس بارہ سال کے بچے کو مذہب کے تمام دقائق سکھا دیے جائیں اور اگر یہ کوئی خرق عادت تھا تو بحیرا کے تکلف کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں سب مرسل ہیں یعنی راوی اول واقعے کے وقت خود موجود نہ تھا اور وہ راوی کا نام بیان نہیں کرتا جو شریک واقعہ تھا۔ اس روایت کا سب سے مستند طریقہ وہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے۔[۲۳]

اس واقعے پر تھوڑا بہت سب ہی لکھتے آرہے ہیں۔ اس میں شک اور مشکل کا سبب یہ ہے کہ یہ واقعہ جہاں سند کے اعتبار سے مضبوط ہے، اور متن کے اعتبار سے سب ہی نقل کرتے چلے آرہے ہیں۔ وہیں اس پر درایتی بنیاد پر خوب اشکال وارد ہوتے ہیں۔ جن پر سیرت نگار لکھتے آرہے ہیں، ان تمام اشکالات کو ایک جدید العہد محقق سیرت حافظ سید فضل الرحمن نے یک جا کیا ہے۔ اور اس واقعے پر ہر بنیاد سے کلام کر کے اسے کم زور قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ ترمذی نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ حسن اور غریب ہے اور ہم اس کو اس طریقے کے سوا کسی اور طریقے سے نہیں جانتے۔

۲۔ اس کا ایک راوی عبدالرحمن بن غزوان ہے جو ابونوح قراد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ یونس بن اسحاق سے اور وہ ابوبکر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابوموسیٰ اشعری سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

۳۔ عبدالرحمن بن غزوان کو بہت سے لوگ ثقہ کہتے ہیں لیکن اکثر اہل فن کے نزدیک وہ ناقابل اعتبار ہے۔

۴۔ علامہ ذہبی عبدالرحمن کو منکر کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی روایتوں میں سب سے بڑھ کر منکر وہ روایت ہے۔ جس میں بحیرا کا واقعہ مذکورہ ہے۔

کا اضافہ ثابت نہیں۔ دیکھیے: ابن ابی شیبہ: ص ۷۹، رقم ۷

[۲۳] سیرت النبی: ج ۱، ص ۱۱۳

۵۔ اس روایت کے بارے میں حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ یہ بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔

۶۔ علامہ ذہبی کے نزدیک اس حدیث کے بعض واقعات موضوع، جھوٹے اور بنائے ہوئے ہیں۔اس کی سند اور متن پر بھی انہیں اعتراضات ہیں اور وہ اس کو شدید منکر کہتے ہیں۔

۷۔ اس کے آخری راوی ابو موسیٰ اشعری ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے اور اوپر کے راوی کا نام بھی نہیں بتاتے۔

۸۔ ابن سعد میں اس کی جو سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی شریک واقعہ نہیں اور نہ وہ کسی صحابی کا نام لیتا ہے۔اور جو روایت معضل ہے اس میں راوی اپنے سے اوپر کے دو راویوں کا نام نہیں لیتا جو تابعی اور صحابی ہیں۔

۹۔ ابو موسیٰ اشعری مسلمان ہو کرے ہجری میں یمن سے مدینے آئے اور بحیرا کا واقعہ اس سے پچاس برس پہلے کا ہے۔ابو موسیٰ خود آپ کی زبان مبارک سے یا کسی اور شریک واقعہ کی زبان سے سننا بیان نہیں کرتے۔اس لیے یہ روایت مرسل ہے۔

۱۰۔ اس واقعے کو ابو موسیٰ سے ان کے صاحب زادے ابو بکر روایت کرتے ہیں مگر ان کے بارے میں کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی بھی ہے یا نہیں؟

۱۱۔ امام احمد بن حنبل اس سے قطعی انکار کرتے ہیں۔بنا بریں یہ روایت منقطع ہے۔

ابن سعد کہتے ہیں کہ ابو بکر ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔یحییٰ کہتے ہیں کہ یہ سخت لاپرواہیں۔

شعبہ ان پر تدلیس کا الزام لگاتے ہیں۔

امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور عام روایتوں کو مضطرب اور ایسی ویسی کہتے ہیں۔

ابو حاتم کے نزدیک وہ راست گو ہیں لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں۔

ابو حاکم کا بیان ہے کہ ان کو اکثر اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا ہے۔

۱۲۔ چوتھا راوی عبد الرحمن بن غزوان ہے۔اس کو ابو نوح قراد بھی کہتے ہیں۔

اگرچہ بہت سے لوگوں نے اس کو ثقہ کہا ہے تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا راوی ہے۔ ممالیک والی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے۔

ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے۔

ابو حیان کہتے ہیں کہ وہ غلطیاں کرتا ہے۔

۱۳۔ اس روایت کے آخر میں یہ بھی ہے کہ بحیرا کے اصرار پر ابو طالب نے آپ ﷺ کو ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ساتھ مکہ واپس بھیج دیا۔ حالانکہ ابو بکرؓ اس وقت آپ ﷺ سے دو سال چھوٹے یعنی دس سال کے

تھے اور بلالؓ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ ایک پر خطر اور تقریباً ایک ماہ طویل سفر میں ایک بارہ سال کے لڑکے کی حفاظت کے لیے اس سے کم عمر کے لڑکوں کو ساتھ بھیجنا بہت ہی عجیب ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بارہ سال کی عمر میں ہی خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو، اہل قافلہ اور قریش کے لوگوں اور روم کے ارباب اقتدار کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ آپ نبی ہونے والے ہیں۔ لیکن یہ بات ناقابل قبول ہے اس لیے کہ یہ قرآن کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ[۲۴] (اور آپ کو تو اس کا خیال بھی نہ تھا کہ آپ پر کتاب نازل کی جائے گی)۔

اور ارشاد ہے: مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ[۲۵] (اس سے پہلے آپ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا)۔

ان آیتوں میں واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ منصب نبوت پر فائز ہونے سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کی بالکل خبر نہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبی بنائے جانے والے ہیں۔ نیز اگر قریش کو ۲۸ سال پہلے ہی یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نبی ہونے والے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اعلان نبوت ان کی توقعات کے خلاف نہ ہوتا اور نہ اس پر ان کا شدید رد عمل ہوتا۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ابو طالب نے راہب کی زبانی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوت کی پیش گوئی اور مذکورہ معجزات دیکھنے کے باوجود آپ کو مکے تو روانہ کر دیا مگر اس واقعے کے ۲۸ سال بعد جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رسالت کا اعلان فرمایا تو ابو طالب نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رسول تسلیم نہیں کیا۔ اگر راہب نے واقعتاً آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کی پیش گوئی کی ہوتی تو ابو طالب مکے پہنچ کر قریش کے لوگوں میں ضرور اس کا چرچا کرتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔

۱۴۔ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ قافلے والوں میں سے قریش کے سرداروں کے پوچھنے پر راہب نے ان کو بتایا کہ جس وقت تم لوگ گھاٹی سے نکلے تو کوئی درخت اور پتھر ایسا باقی نہ رہا جس نے سجدہ نہ کیا ہو اور درخت اور پتھر صرف نبی کو سجدہ کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قرآن کریم کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ[۲۶] (کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں میں ہیں

---

[۲۴]۔ القصص: ۸۶

[۲۵]۔ الشوریٰ: ۵۲

[۲۶]۔ الحج: ۱۸

اور جو زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے آدمی، سب اللہ کو سجدہ کرتے ہیں)۔

۱۵۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ آپ اونٹ چرانے گئے ہوئے تھے۔ جب آپ ﷺ تشریف لائے تو ایک بادل آپ ﷺ پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ لوگ آپ ﷺ کے پہنچنے کے پہلے ہی درخت کے سائے میں جگہ لے چکے تھے۔ لہٰذا آپ ﷺ ایک جانب بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ کے بیٹھتے ہی درخت کا سایہ آپ کی طرف جھک گیا۔ جب بادل آپ ﷺ پر سائے کیے ہوئے تھا تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ اس وقت درخت کا سایہ آپ کی طرف مائل ہو، کیوں کہ بادل کا سایہ درخت کے سائے کو ختم کر دیتا ہے۔

۱۶۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اس واقعے کے بعد بھی اگر آپ ﷺ کئی بار تجارتی سلسلے میں شام تشریف لے گئے ہیں۔ اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آتا تو آئندہ آپ ﷺ کیسے جا سکتے تھے؟ اور اپنی چھوٹی عمر میں تو آپ ﷺ کو پہچان لیا گیا کہ آپ ﷺ نبی ہونے والے ہیں بعد میں آپ ﷺ کو کیوں نہ پہچانا جا سکا؟

اس تفصیل کی رو سے بحیرا کا قصہ درست معلوم نہیں ہوتا۔ گو قدیم و جدید تمام سیرت نگار اس کو بیان کرتے چلے آرہے ہیں۔[۲۷]

اس واقعے پر عصر حاضر کے دیگر سیرت نگاروں کو بھی شدید اشکالات ہیں، چنانچہ محمد الغزالی کہتے ہیں:

یہ واقعہ خواہ صحیح ہو یا بے اصل، بہر حال یہ بات طے شدہ ہے کہ نبی ﷺ کی آئندہ زندگی پر اس کا کوئی اثر ظاہر نہیں ہوا۔ نہ آنحضرت ﷺ اس کی بنیاد پر نبوت کی آس لگائے رہے اور نہ قافلہ والوں نے اس کا چرچا کیا۔[۲۸]

محققین کے نزدیک یہ روایت موضوع ہے۔ اس میں اس واقعے سے مشابہت ہے جسے اہل انجیل بیان کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت کے فوراً بعد کچھ لوگ انہیں قتل کرنے کے لیے تلاش کر رہے تھے۔ اور عیسائیوں کے یہاں پایا جانے والا یہ واقعہ اس واقعے سے مشابہت رکھتا ہے جیسے بدھ مت کے پیروکار بیان کرتے ہیں کہ گوتم بدھ کی جب ولادت ہوئی تو دشمنوں نے انھیں قتل کرنے کے لیے تلاش

۲۷۔ فضل الرحمٰن، سید۔ ہادئ اعظم۔ زوار اکیڈمی پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۴ء: ج۱، ص ۲۲۴۔ اعتراضات کی یہ تمام تفصیل فاضل محقق کی کتاب ہادی اعظم سے ماخوذ ہے، جس کا سبب صرف یہ ہے کہ اس کتاب میں بحیرہ کے واقعے کے حوالے سے سنداً اور متناً نقد کے تمام پہلو جس تفصیل کے ساتھ یک جا کیے گئے ہیں، اس تفصیل سے کہیں اور موجود نہیں۔

۲۸۔ محمد الغزالی، فقہ السیرہ۔ قاہرہ، دار الکتب الحدیثہ، ۱۹۸۸ء: ص ۶۸

کیا۔

علمائے سنت روایات کی تحقیق متن اور سند دونوں پہلوؤں سے کرتے ہیں۔ اگر ان سے پختہ علم اور ظن غالب حاصل نہ ہو تو ان کی پروا نہیں کرتے۔ پیغمبروں کی جانب بہت سی خرافات منسوب کر دی گئی ہیں۔ اگر انہیں فنِ حدیث کے مقررہ قواعد کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان کا کھوٹ ظاہر ہوتا ہے اور ان کی بنا پر انہیں رد کرنا مناسب ہوتا ہے۔[۲۹]

اس کے برعکس اس کتاب کے محقق علامہ ناصر الدین البانی جنھوں نے اس کی احادیث کی تخریج کی ہے، اس واقعے اور اس کی روایات کو قبول کرتے ہیں، اور ان کی تصحیح فرماتے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ صحیح ہے۔ اس کی روایت امام ترمذیؒ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ حدیث حسن ہے"۔ جزری نے لکھا ہے کہ "اس کی سند صحیح ہے، البتہ اس میں ابو بکرؓ اور بلالؓ کا ذکر صحیح نہیں ہے"۔ اس کی روایت بزار نے بھی کی ہے۔ اس میں ہے کہ "آپ ﷺ کے چچا نے ایک آدمی کے ساتھ آپ کو واپس بھیج دیا"۔[۳۰]

اس حدیث کو موضوع کہنا صحیح نہیں، اس کی روایت ترمذی نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے کی ہے اور اس کی سند صحیح ہے۔ محض عیسائیوں کے واقعے سے مشابہت کی بنا پر اس کی صحت پر حرف نہیں آئے گا۔ اہل انجیل کے بہت سے بیانات قرآنی بیانات کے مشابہ ہیں مثلاً یہ کہ فرعون حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت انہیں قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات انجیل اور قرآن دونوں میں مذکور ہے۔ کیا محض انجیل سے مشابہت کی بنا پر ہم قرآن کے اس بیان کو رد کر دیں گے؟[۳۱]

اس بنا پر یہ مقام مشکلات سیرت میں سے ایک ہے، جس پر مزید غور و فکر کی ضرورت ہے۔

مواخات

مواخات اہم ترین واقعاتِ سیرت میں سے ہے، اس کا مفہوم ہے دو افراد میں رشتۂ اخوت قائم کرنا۔ بہت سی سیاسی، معاشرتی، معاشی، سماجی اور نفسیاتی وجوہ کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مابین مواخات قائم کی۔ یہ ایک اہم موقع تھا، اور رسول اللہ ﷺ کے تدبر کا اہم نمونہ۔ آپ ﷺ نے نہایت بصیرت سے کام لیتے ہوئے بہت سے امکانی مسائل کا ادراک کیا اور ان کی پیش بندی اور منصوبہ بندی فرماتے ہوئے ایک نیا انتظامی اسلوب متعارف کرایا، مگر سر دست ہمیں مواخات کی سیاسی، سماجی

---

[۲۹] ۔ محمد الغزالی، فقہ السیرہ۔ قاہرہ، دار الکتب الحدیثۃ، ۱۹۸۸ء: ص ۶۸

[۳۰] ۔ حوالہ سابق، حاشیہ: ص ۶۸

[۳۱] ۔ حوالہ سابق، حاشیہ: ص ۶۹

اور معاشی اہمیت سے بحث نہیں۔ یہ واقعہ ایک حوالے سے مشکلات السیرہ کا بھی عنوان ہے۔ مواخات کی ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مختلف صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے مابین رشتۂ اخوت قائم کیا۔ اور یہ مواخات ہجرت کے پانچ ماہ بعد ۴۵ مہاجرین اور ۴۵ انصار کے مابین حضرت انسؓ کے مکان میں ہوئی۔ آنحضرت ﷺ نے انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا ''یہ تمہارے بھائی ہیں'' پھر مہاجرین وانصار میں سے ایک ایک کو بلاتے اور فرماتے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔[۳۲]

ایک قول کے مطابق مواخات ہجرت کے نو ماہ بعد ہوئی، اس کے علاوہ ایک سال بعد، تین ماہ بعد، سات ماہ اور آٹھ ماہ بعد کے اقوال بھی ہیں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ بدر کے موقع پر مواخات ہوئی اور ایک قول مسجد نبوی کی تعمیر سے قبل کا بھی ہے۔[۳۳]

اس مواخات کو عام طور پر سیرت نگار ایک بار اور ہجرت کے بعد بیان کرتے ہیں۔ جیسا کہ اقوال ذکر ہوئے، مگر ان ہی اقوال میں یہ قول بھی ملتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر آپ ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ نے لوگوں کے درمیان تو مواخات کرادی ہے، مجھے اس میں شریک نہیں کیا گیا، تو آپ نے فرمایا کہ میں تمہارا بھائی ہوں۔[۳۴] یعنی آپ ﷺ نے مواخات میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شریک کرتے ہوئے ان کی مواخات اپنے ساتھ فرمالی۔

اسی طرح ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما میں مواخات فرمائی، جب کہ یہ دونوں مہاجرین صحابہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ روایت بھی مضبوط درجے کی ہے۔ چنانچہ اسے حاکم اور ابن عبد البر نے سندِ حسن کے ساتھ روایت کیا ہے، اور ضیاء الدین مقدسی نے اسے طبرانی کبیر کے حوالے سے اپنی کتاب المختارہ میں نقل کیا ہے، اور ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ المختارہ کی روایات کی سند قوی ہے۔[۳۵]

دوسری جانب ایک روایت میں ابو بکر و عمر، طلحہ اور زبیر، عبد الرحمن بن عوف اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم وغیرہ کے مابین مواخات کا بھی ذکر ہے۔[۳۶]

یہ وہی روایت ہے جس کے آخر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے مابین مواخات کا

---

[۳۲]۔ سہیلی، الروض الانف۔ دار المعرفہ، بیروت، ۱۹۷۸ء: ج ۲، ص ۲۵۲۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۷۳

[۳۳]۔ فتح الباری: ج ۷، ص ۳۴۵۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۷۳۔ شامی: ج ۳، ص ۳۶۷

[۳۴]۔ سمہودی، وفاء الوفاء: ج ۱، ص ۲۶۶

[۳۵]۔ ابن حجر: ص ۳۳۹

[۳۶]۔ حوالہ سابق

بیان ہے، یہ تمام مکی اور مہاجر صحابہ کرام ہیں۔

اب اشکال یہ ہے کہ مدینے میں ہونے والی مواخات تو ایک انصاری اور ایک مہاجر کے مابین ہوئی تھی، یہاں مہاجرین کے مابین اس مواخات کا کیا مفہوم ہے؟ اسی طرح بعض دوسرے مکی صحابہ کے مابین بھی مواخات کا ذکر ملتا ہے، مگر یہ سوال متوسطین سیرت نگاروں کی تحریروں سے اس لیے پیدا ہوا کہ روایات کو جمع نہیں کیا جا سکا۔ چنانچہ بالکل ابتداء ہی میں ابن حبیب بغدادی اور بلاذری نے اس حوالے سے واضح روایات نقل کر دی تھیں۔ ان کا خلاصہ یہی ہے کہ یہ عمل مواخات دو بار ہوا ہے، پہلی بار مکہ مکرمہ میں اور دوسری بار بعد از ہجرت مدینہ منورہ میں، جس کی تاریخیں بیان ہوئیں۔ اور حضرت علیؓ کا واقعہ مکی عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ چنانچہ ابن حبیب نے مکی عہد کی مواخات کا ذکر کرتے ہوئے باہم رشتہ اخوت میں منسلک ہونے والے صحابہ کی ایک فہرست یوں بیان کی ہے۔

حضرت حمزہ بن عبد المطلب اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما (رسول اللہ ﷺ کے آزاد کردہ غلام) کے درمیان

حضرت ابو بکر اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہما کے درمیان

حضرت عثمان اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہما کے درمیان

حضرت الزبیر بن العوام اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے درمیان

حضرت عبیدہ بن الحارث اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہما کے درمیان

حضرت مصعب بن عمیر اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہما کے درمیان

حضرت عبیدہ بن الجراح اور حضرت سالم مولیٰ ابی حذیفہ رضی اللہ عنہما کے درمیان

حضرت سعید بن زید اور حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہما کے درمیان۔[۳۷]

اسی طرح ابن عبد البر نے واضح طور پر لکھا ہے کہ مواخات کا عمل دو بار ہوا ہے، پہلی بار صرف مہاجرین کے مابین، یہ مکہ میں ہوا ہے، دوسری بار بین المہاجرین والانصار بعد از ہجرت۔[۳۸]

مکی صحابہ کرام کے مابین مواخات کا اصل محل مکی مواخات ہی ہے، جو دوسری روایات سے ثابت بھی ہو رہی ہے، نہ یہ کہ ان کی تاویل کی جائے، جو غیر منطقی بھی ہے۔ اس لیے ان روایات کو ابنِ حبیب بلاذری اور ابن عبد البر کی تصریحات کے مطابق تعدّدِ واقعہ پر محمول کرتے ہوئے مکی اور مدنی مواخات میں تقسیم کیا جائے گا۔

۳۷۔ بلاذری، احمد بن یحییٰ، انساب الاشراف، تحقیق محمد حمید اللہ۔ دار المعارف، مصر ۱۹۵۹ء: ج ۱، ص ۲۷۰۔ ابن حبیب، المحبر۔ دار المعارف العثمانیہ، حیدر آباد دکن، ۱۹۴۲: ص ۷۰، ۷۱

۳۸۔ فتح الباری: ج ۷، ص ۳۳۸

اسی طرح روایات کے جمع کی صورت اختیار کرکے اس مشکل کو حل کیا جاسکتا ہے۔ اس بحث سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ قدیم کتب سیرت خصوصاً ابتدائی تین صدی کی کتب سیرت کو پیش نظر رکھنا زیادہ مفید ہوتا ہے کہ اس کے نتیجے میں بعد کی تحریروں سے پیدا ہونے والے ابہام جلد دور ہو جاتے ہیں اور قدیم مگر کسی بھی سبب سے غیر معروف رہ جانے والی روایات تک رسائی ممکن ہو جاتی ہے۔

ام معبد کا واقعہ

واقعات سیرت میں سفر ہجرت کی اہمیت سے کسے کلام ہوگا، سفر ہجرت میں بہت سے واقعات پیش آئے، ان میں ایک اہم واقعہ قصہ ام معبد کے نام سے کتب سیرت میں محفوظ ہے، اور تواتر سے نقل ہوتا چلا آیا ہے، یہ واقعہ بھی مشکلات السیرہ میں شامل کیے جانے کے لائق ہے، پہلے یہ واقعہ دیکھیے۔

سیرت نگار بیان کرتے ہیں کہ سفر ہجرت کے دوران آپ ﷺ کا گزر مقام قدید میں واقع ام معبد عاتکہ بنت خالد خزاعی کے خیمے پر ہوا۔ یہ خاتون اپنے خیمے کے دروازے پر بیٹھ کر مسافروں کی مہمان نوازی اور خاطر داری کیا کرتی تھیں اور انہیں کھانا، پانی دیا کرتی تھیں۔ آپ ﷺ نے ام معبد سے گوشت اور کھجور (اور ایک روایت کے مطابق دودھ وغیرہ کھانے پینے کی اشیا) کے بارے میں استفسار کیا تاکہ اپنی ضرورت کے لیے کچھ خریدا جاسکے۔ ام معبد نے جواب دیا کہ اگر کچھ موجود ہوتا تو میں از خود پیش کر دیتی، حضور ﷺ نے دودھ کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے اس کا بھی انکار کیا، پھر آپ ﷺ نے خیمے کے ایک گوشے میں ایک دبلی پتلی بکری کھڑی ہوئی دیکھی، تو پوچھا کہ کیا اس میں دودھ ہے؟ ام معبد نے کہا کہ یہ بہت کم زور ہے، اس لیے دودھ دینے کی حالت میں نہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر اجازت ہو تو میں اسے دوہ لوں؟ ام معبد نے کہا کہ اگر آپ ﷺ دوہ سکتے ہیں تو ضرور دوہ لیجیے، پھر آپ ﷺ نے بسم اللہ کہہ کر بکری پر ہاتھ پھیرا، پھر بسم اللہ پڑھ کر بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا۔ اور فرمایا اے اللہ ام معبد کی اس بکری میں برکت عطا فرما۔ اس کے ساتھ ہی تھن دودھ سے بھر گئے۔ آپ ﷺ نے ام معبد سے دودھ کے لیے برتن طلب فرمایا، پھر آپ ﷺ نے دودھ دوہا تو برتن دودھ سے بھر گیا یہ دودھ آپ ﷺ نے ام معبد اور اپنے ساتھیوں کو پلایا پھر سب سے آخر میں آپ ﷺ نے دودھ نوش فرمایا اور فرمایا کہ قوم کو پلانے والا آخر میں پیتا ہے، پھر دوسری مرتبہ دودھ دوہا اس بار بھی برتن دودھ سے بھر گیا۔ یہ دودھ ام معبد کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ پھر آپ ﷺ آگے روانہ ہو گئے۔ جب ام معبد کا شوہر ابو معبد جنگل سے بکریاں چرا کر واپس آیا تو وہ دودھ دیکھ کر حیران ہو گیا۔ اس نے پوچھا کہ یہ دودھ کہاں سے آیا تو ام معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص یہاں آیا تھا یہ اسی کی برکت ہے۔ پھر ام معبد نے تمام قصہ اپنے شوہر سے بیان کر دیا، اس پر ابو معبد نے کہا کہ خدا کی قسم یہ وہی شخص

ہوگا جس کی تلاش و جستجو میں قریش سر گرداں ہیں۔ میں ضرور ان کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔[۳۹]

دوسری روایت میں ہے کہ امِ معبد کے شوہر نے ان سے کہا کہ اس مبارک شخصیت کا حلیہ بیان کرو، پھر امِ معبد نے حضور ﷺ کا حلیہ بیان کیا، انہوں نے کہا وہ خوب صورت و روشن چہرے اور متناسب ساخت کے حامل تھے، نہ پیٹ نکلا ہوا، نہ سر چھوٹا، خوب صورت و حسین آنکھیں کشادہ و سیاہ لمبے ابرو، آواز میں لطافت، گردن لمبی، آنکھوں کی پتلیاں بالکل کالی اور ڈھیلے نہایت سفید تھے، آنکھیں سرمگیں تھیں، بھویں لمبی اور باریک مگر ایک دوسرے سے ملی ہوئی تھیں، بال بالکل سیاہ، ایسی شخصیت تھی کہ خاموش رہیں تو پر وقار نظر آئیں اور گفتگو کریں تو دل موہ لیں، دور سے دیکھنے پر لوگوں میں سب سے زیادہ حسین و خوش نما نظر آئیں اور قریب سے ملاقات ہو تو سب سے زیادہ دل نشیں محسوس ہوں، گفتگو شیریں اور واضح نہ کم سخن نہ بسیار گو، ان کی گفتگو پروئے ہوئے موتیوں کی مانند (مربوط و دل کش) میانہ قد جو آنکھوں کو نہ تو چھوٹے پن کی وجہ سے برا معلوم ہو نہ لمبے ہونے کی وجہ سے بد نما لگے، (گویا کہ) دو شاخوں کے درمیان ایک شاخ ہے۔ جو خوش کن منظر پیش کرتی ہے، مرتبے کے لحاظ سے ان میں سب سے اعلیٰ۔ ان کے ساتھی ان کے گرد دائرہ باندھے ہوئے، جب وہ کچھ کہے تو سب سراپا گوش بن جائیں اور اگر حکم دے تو تعمیل میں ایک دوسرے پر سبقت پانے کی کوشش کریں، سب کا مخدوم اور سب کا مرجع، نہ ترش رو نہ ہی تند خو۔[۴۰]

الفاظ کی ترتیب اور تھوڑے فرق سے، یہ روایت سیرت ابن کثیر، زرقانی اور عیون الاثر میں بھی ہے۔[۴۱]

یہ قصہ کتب سیرت اور حدیث میں متعدد طرق اور بہت سے راویوں سے منقول ہے۔ ابن اسحاق نے اس کو بغیر سند کے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ابن سعد میں موجود روایت مرسل ہے جو حر بن الصباح عن ام معبد کی سند سے ہے۔[۴۲]

اہم بات یہ ہے کہ ابو معبد کا انتقال آپ ﷺ سے قبل ہو چکا تھا۔[۴۳]

طبرانی نے معجم الکبیر میں جو روایت نقل کی ہے، اسے ہیثمی نے مجمع الزوائد میں لیا ہے اور پھر لکھا ہے

---

[۳۹] ۔ ابن کثیر، السیرۃ النبویہ۔ داراحیاء، التراث العربی: ج ۲، ص ۲۶۰، ۲۶۱۔ حلبی۔ انسان العیون (سیرت حلبیہ)۔ داراحیاء التراث العربی، بیروت: ج ۲، ص ۲۲۴، ۲۲۵۔ زاد المعاد: ج ۳، ص ۵۶، ۵۷

[۴۰]۔ زاد المعاد: ج ۳، ص ۵۶۔ ۵۷

[۴۱]۔ سیرۃ ابن کثیر: ج ۲، ص ۲۶۱۔ عیون الاثر: ج ۱، ص ۳۰۴، ۳۰۵۔ زرقانی: ج ۱، ص ۳۴۱

[۴۲]۔ ابن حجر۔ الاصابہ فی تمییز الصحابہ۔ مکتبہ تجاریہ الکبریٰ، مصر، ۱۹۳۹ء: ج ۲، ص ۲۲۱

[۴۳]۔ الاصابہ: ج ۱۲، ص ۲۱

وفی اسنادہ جماعۃ لم اعرفھم یعنی اس کی اسناد میں ایسے لوگوں کی جماعت ہے، جن کو ہم نہیں جانتے۔

حاکم کی روایت کی ذہبی نے توثیق کی ہے مگر اس پر البانی نے کہا ہے فیا قالاہ نظر کم و بیش یہی صورت بزار، بیہقی وغیرہ کی روایت کی ہے۔[۴۴]

اس واقعے کی اسناد میں بعض راوی مجہول ہیں اور بعض متہم بالکذب مثلاً محمد بن یحییٰ بن سلیمان القرشی، عبدالعزیز بن یحییٰ اور عبدالملک بن وہب المذحجی، سلیمان بن عمرو نخعی متہم بالکذب ہیں اور محرز بن مہدی، ہشام بن خنیس، عبدالرحمن بن عضبہ مجہول ہیں۔[۴۵]

البتہ ابن کثیر اس واقعہ کی اسانید کے حوالے سے لکھتے ہیں: انھا مشھورۃ مرویۃ من طرق یشد بعضھا بعضاً[۴۶] (یہ واقعہ مشہور ہے۔ایسے طرق سے مروی ہے جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں)۔

مذکورہ بحث کے علاوہ اس واقعے کے متعلق یہ باتیں بھی قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ حضرت ابو بکرؓ کہتے ہیں کہ چوں کہ ہماری نگرانی ہو رہی تھی اور لوگ ہماری گھات میں تھے اس لیے ہم غار سے رات کے وقت باہر نکلے۔دوسری روایت میں ہے کہ ہم اپنے راستے کے رہ نما کے ہم راہ علی الصبح غار سے نکل کر ساحل سمندر کے راستے مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔[۴۷]

۲۔ سراقہ بن مالک کہتے ہیں کہ میں اپنی قوم نبی مدلج کی ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ اے سراقہ میں نے ابھی چند اشخاص کو ساحل کے راستے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔میرا خیال ہے کہ وہ محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھی ہیں۔[۴۸]

ان دونوں روایتوں سے یہ بات تو بالکل یقینی ہے کہ ہجرت مدینہ کے موقعے پر آپ ﷺ نے مکے سے رابغ تک کا سفر عام راستہ چھوڑ کر ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ غیر معروف راستے سے کیا تھا جو عین قرین مصلحت اور حکمت ہے۔

۳۔ ان روایتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مشرکین اور ان کے جاسوس آپ ﷺ کی تلاش میں دور دراز علاقوں تک پھیلے ہوئے تھے۔

۴۔ مشرکین نے آپ ﷺ کو اور حضرت ابو بکرؓ کو زندہ گرفتار کرنے یا قتل کرنے پر ہر ایک کے لیے

---

[۴۴]۔ دیکھیے: السیرۃ النبویہ۔ محمد بن اسحاق بن یسار المطلبی المدنی۔ دارالکتب العلمیہ۔ بیروت، لبنان: ص ۳۸۸

[۴۵]۔ تفصیل کے لئے: عمری، اکرم ضیا، دکتور۔ السیرۃ النبویہ الصحیحہ: ج ۱، ص ۲۱۳

[۴۶]۔ ابن اکثیر۔ البدایۃ والنہایۃ۔ مطبعہ سعادہ، مصرف، طبع اولیٰ، ۱۹۳۲ء: ج ۳، ص ۲۰۰

[۴۷]۔ بخاری۔ الصحیح۔ دارالکتب العلمیہ، ۲۰۰۵ء بیروت، لبنان: ج ۲، ص ۵۱۶، رقم ۳۹۰۵، ص ۵۲۳، رقم ۳۹۱۷

[۴۸]۔ بخاری: ج ۲، ص ۵۱۸، رقم ۳۹۰۶

سو اونٹ کی دیت کا اعلان کر رکھا تھا۔

۵۔ آپ کا یہ سفر انتہائی غیر معمولی حالات میں اور انتہائی غیر محفوظ تھا۔

۶۔ قدید میں ام معبد کا خیمہ عام راستے پر واقع تھا اور ساحل سے بہت ہٹا ہوا تھا۔ مسافر اپنی ضروریات کے لیے وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ ایسے میں نسبتاً محفوظ اور غیر معروف راستہ چھوڑ کر آپ کا ام معبد کے خیمے پر آنا اپنے آپ کو انتہائی خطرے سے دوچار کرنے اور حکمت و مصلحت اور حفاظت کے تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔

۷۔ نیز حضرت ابو بکر کی روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رات بھر اور اگلے روز دوپہر تک مسلسل سفر کر کے ایک چٹان کے سائے میں آرام فرمایا۔ غار سے روانگی کے بعد اگلے روز دوپہر تک تقریباً ۱۸۔۲۰ گھنٹے کے سفر میں اگر اوسط رفتار ۳ میل فی گھنٹہ ہو تو تقریباً ساٹھ میل سفر طے ہونا چاہیے۔

۸۔ ام معبد کے خیمے مکہ سے تقریباً ۸۰ میل اور رابغ کے تقریباً ۴۳ میل کے فاصلے پر تھے۔

۹۔ جس جگہ دوسرے روز دوپہر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے چٹان کے نیچے آرام فرمایا تھا وہ ام معبد کے خیمے سے ۲۰۔۲۵ میل پہلے یا اس سے کچھ کم و بیش فاصلے پر ہونی چاہیے۔

۱۰۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا سفر عام راستے سے ہٹ کر ساحل کے ساتھ تھا۔ ساحل چھوڑ کر ام معبد کے خیمے پر جانے اور واپس ساحل پر آنے کا مطلب اپنے سفر میں خاطر خواہ اضافہ کرنا ہے جو انتہائی خطرے کا باعث ہوتا۔ حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کم سے کم وقت میں مختصر ترین راستے سے سفر کرتے۔

۱۱۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سفر کا محض دوسرا دن تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ام معبد کے خیمے سے چند میل پہلے ہی چٹان کے نیچے آرام فرمایا اور دودھ نوش فرمایا، نیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ سے زاد راہ کا تھیلا لے کر غار ثور روانہ ہوئے تھے جو حضرت اسماء اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے تیار کیا تھا۔ غار ثور کے قیام کے دوران تینوں دن حضرت اسماء آپ کے لیے کھانا لاتی تھیں اور حضرت ابو بکرؓ کے غلام عامر بن فہیرہ اپنی بکریوں کو لے کر غار پر آتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دودھ پیش کرتے تھے۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ام معبد کے خیمے پر جا کر ان سے اشیائے خورد و نوش خریدنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ روایت اور درایت کے ان پہلوؤں کی وجہ سے ام معبد کا واقعہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا۔[۴۹]

۴۹۔ ہادئ اعظم: ج ۱، ص ۴۰۵۔ یہ واقعہ بھی جناب سید فضل الرحمن کی کتاب سیرت ہادئ اعظم سے لیا گیا ہے، کیوں کہ

اختتامیہ

مشکلات السیرہ کی ضرورت واہمیت اور مقاصد کے بیان کے بعد اس کے ابتدائی خدوخال پیش کرنے کے ساتھ کوشش کی گئی ہے کہ اس ضمن میں چند مثالیں بھی پیش کر دی جائیں۔ یہ مثالیں محض اوپر بیان ہونے والے ضوابط کی تفہیم و تشریح کی غرض سے پیش کی گئی ہیں، ان سطور میں مکی عہد کے حوالے سے مشکلات السیرہ کا استقصا مطلوب نہیں تھا، وگرنہ ایسی کئی ایک مثالیں عہد مکی سے بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔

ان سطور سے مقصود یہ ہے کہ سیرت کے مطالعے کے روایتی انداز سے ہٹ کر نئے مسائل کو ذہن میں رکھ کر سیرت نگاری کے فنی پہلوؤں کی جانب بھی توجہ کی جائے، اس حوالے سے کئی تشنہ پہلو بھی ہماری توجہ کے منتظر ہیں۔ نئے لکھنے والوں کو اس جانب توجہ کرنی چاہیے۔ چونکہ ہمارا یہ موضوع عہد مکی تک محدود تھا، اس لیے بہ طور مثال پیش کیے جانے والے واقعات کو بھی عہد مکی تک ہی محدود رکھا گیا ہے۔ یہ اس موضوع پر مبتدیانہ کاوش ہے، امید ہے کہ اس موضوع کو پذیرائی ہو گی، اور اہل علم و تحقیق بھی اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

اللہ تعالیٰ سیرت طیبہ سے راہ نمائی کی ہمیں توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین

وصلی اللہ علی النبی الامی وعلی آلہ وصحبہ اجمعین

ان کے ہاں یہ واقعہ اور اس پر نقد معاصر سیرت لٹریچر میں زیادہ مفصل صورت میں موجود ہے۔

مولانا محمد یعقوب بنیانی لاہوری
عہد اورنگ زیب کا ایک حق گو قاضی عسکر

پروفیسر شریف حسین قاسمی
دہلی
indianmanuscript@gmail.com

دلی ایک عجیب شہر ہے۔ یہ در حقیقت محض ایک شہر اور آبادی نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک تمدن اور ایک شاندار تاریخ کا نام ہے۔ اسے عرصہ دراز سے ہندوستان کا سیاسی مرکز رہنے کا شرف حاصل ہے۔ سیاسی مرکزیت کی وجہ سے دہلی نے ہندوستان کی تاریخ سرگذشت میں ایک نمایاں اور اہم مقام حاصل اور کردار ادا کیا ہے۔ اس وجہ سے اسے حضرت دہلی کہا گیا۔ مختلف بادشاہوں کے درباروں میں اگر یہاں ایک طرف ہندوستان کی سیاسی سرنوشت و تاریخ لکھی جاتی رہی تو دوسری طرف یہاں کے گلی کوچوں میں اکثر درباروں سے بے نیاز اپنی اپنی درسگاہوں اور خانقاہوں میں گوشہ نشین علما، صوفیا اور مشائخ حضرات علم و معرفت کی شمعیں روشن کیے رہے۔ انسانیت، محبت، اخوت اور علوم کا درس دیتے رہے۔ اپنے شاگردوں، خلفا اور مریدوں کے ذریعہ تمام ہندوستان میں علم و معرفت کا نور پھیلاتے اور اخلاقی، انسانی اور علمی اقدار کے دائمی اثرات پر زور دیتے رہے۔ اس وجہ سے اہل علم و مورخین نے دہلی کو قبۃ الاسلام، بغداد ہند، خرد مکہ وغیرہ کے محترم خطابات سے یاد کیا ہے۔

ہندوستان میں ترکوں کی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی دہلی علما و مشائخ کا مرکز بن جاتی ہے۔ مشائخ خانقاہیں تعمیر کرتے ہیں اور علمائے دین ہر مسجد اور اپنی قیام گاہ کو بھی درسگاہ میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ سرکار بھی مدارس قائم کرتی ہے۔ حوض خاص پر فیروز شاہ تغلق کے تعمیر کردہ مدرسے کی حیثیت تو آج کی ایک رہائشی یونیورسٹی سے کم نہ تھی۔

ساتویں صدی ہجری/تیسری صدی عیسوی عالم اسلام کے لیے قیامت کی صدی تھی۔ منگولوں نے اسی دور میں عالم اسلام کو اپنے وحشیانہ اور ظالمانہ حملوں کا نشانہ بنایا اور اس وجہ سے وہاں کی فضا اس قابل نہیں رہی کہ علما اور مشائخ یکسوئی سے اپنے اپنے فرائض انجام دے سکیں۔ علما و مشائخ اور مدارس و خانقاہوں پر اس دور میں کیا قیامت ہوئی اس کا اندازہ اس دور سے قریب کے معروف و معتبر مورخ عطا ملک جوینی کے اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔

اس دور میں مشائخ و علما سخت آزمائش سے دوچار تھے۔ ان کی بہت بے عزتی کی گئی۔ اس حادثے میں کتب خانے، مساجد اور مدارس بہت زیادہ تباہ و برباد ہوئے۔[1]

منگولوں کے ہاتھوں کثیر تعداد میں انسانوں کی بہیمانہ قتل و غارت گری اور ان کی آبادیوں کی مکمل تباہی و بربادی کے بارے میں اسی جوینی کے تاثرات رونگٹے کھڑے کر دیتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

''ہر شہر اور دیہات کو کئی کئی مرتبہ تباہ برباد کیا گیا۔ اجاڑا گیا۔ جب تک دنیا باقی ہے اور انسان اس دنیا میں پیدا ہوتے رہیں گے اس وقت تک بھی ان آبادیوں اور بستیوں میں قتل کیے جانے والے انسانوں کی تعداد کا دسواں حصہ پیدا نہیں ہو سکے گا۔[2] اس حادثہ جانکاہ سے جو بچ گیا اس کا جس طرف منہ اٹھا، ادھر چل دیا۔ عام لوگوں کے علاوہ بہت سے علما و مشائخ کی نظر انتخاب ہندوستان خاص طور پر دہلی پر پڑی۔ جہاں سیاسی و اقتصادی استحکام تھا اور جہاں وہ ذہنی سکون اور اطمینان خاطر کے ساتھ اپنی قوتوں کو حصول علم و معرفت، ترویج علم اور تبلیغ دین کے لیے وقف کر سکتے تھے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا''۔

محمد بن تغلق کے دور حکومت (۱۳۲۵/۷۲۵-۱۳۵۱/۷۵۲) میں عصامی نے اپنی تاریخی مثنوی فتوح السلاطین میں عالم اسلام سے ایسے ہی صاحبان علم و فضل اور دیگر اہل حرفہ کے دہلی منتقل ہونے کی نہایت مناسب الفاظ و انداز میں تصویر کشی کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

بسی سیدان صحیح النسب — رسیدند دروی زملک عرب
بسی کاسبان خرسان زمین — بسی نقشبندان اقلیم چین
بسی عالمان بخارا نژاد — بسی زاہد وعابداز ہربلاد
زہر ملک وہر جنس صنعت گراں — زہر شہر وفاصل سیمیں بران
حکیمان یونان، طبیبان روم — بسی اہل دانش زہرمز وبوم
دران شہر فرخندہ جمع آمدند — چوپروانہ برنور شمع آمدند[3]

اٹھارویں صدی کے معروف عالم و محدث حضرت شاہ ولی اللہ کو ذہن میں رکھ کر علامہ اقبال نے تقریباً

---

[1] تاریخ جہانگشا: عطاملک جوینی، بہ تصحیح مرزا محمد بن عبدالوہاب قزوینی (گب میموریل سیریز)، ج۱، ص ۸۲-۸۰۔
[2] ایضاً، ج۱، ص ۷۵۔ اسی طرح کے تاثرات ابن اثیر نے اپنی کتاب الکامل: ج۹، ص ۳۳۹ میں بھی قلم بند کیے ہیں۔
[3] فتوح السلاطین: عصامی، ترتیب محمد یوشع، مدراس۔ ص ۱۱۴۔

یہی بات کہی ہے:

اے جہاں آباد، اے گہوارہ علم و ہنر	ہیں سراپانالہ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر	یوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخر روزگار ایسا بھی ہے	تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

جہاں تک علم و دانش اور معارف اسلامی کا تعلق ہے، یہ وہی ہے صورت حال دہلی کی۔

اس وقت دہلی کی ایک ایسی شخصیت کا تعارف کرانا مقصود ہے جس نے معارف و روایات اسلامی کی ترویج میں قابل قدر حصہ لیا اور صدائے حق بلند کرنے میں کسی بھی قسم کی مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا اور یہ ہیں مولانا محمد یعقوب بنیانی لاہوری ثم الدہلوی۔

ان کا تعارف کرانے سے پہلے یہ بنیادی بات عرض کر دینا ضروری ہے کہ علمائے دین و عرفائے اسلام کا جتنا بھی تھوڑا بہت مطالعہ راقم نے کیا ہے اس نے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ ہمارے جتنے بھی قابل ذکر صوفیہ حضرات رہے ہیں وہ پہلے علمائے دین تھے۔ اس کے بعد انہوں نے عرفان و تصوف کے میدان عمل میں قدم رکھا ہے۔ مثال کے طور پر حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (۷۲۵ھ) بنیادی طور پر فقیہ تھے۔ اس میدان میں تربیت کامل کے بعد ہی آپ نے عرفان و تصوف کے میدان کو اپنی علمی اور عرفانی جد وجہد کے لیے انتخاب کیا۔ اس وجہ سے آپ کو صوفی فقیہ کہنا مناسب ہے۔ آپ کا طریق کار یہ رہا تھا کہ جب تک کوئی معارف اسلامی کی تعلیم مکمل نہیں کر لیتا تھا اس وقت تک آپ اسے اپنی خلافت سے نہیں نوازتے تھے اور فرماتے تھے کہ ان پڑھ صوفی مسخر شیطان ہو جاتا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ (م ۱۷۶۲ء) نے قرآن حکیم اور حدیث کے علم کو ایک پیر و مرشد کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ صوفیائے صافی کی رہائش گاہیں جو اصطلاحاً خانقاہ یا جماعت خانے کہلاتی ہیں، ان کا ایک مفہوم درسگاہ بھی ہے۔ جماعت خانہ یعنی کلاس روم، مدارس و خانقاہیں ایک ہی نوعیت کی درسگاہیں تھیں جہاں معارف اسلامی کی مختلف شاخوں کا درس دیا جاتا تھا۔ اس طرح مسلم سماج میں ان دونوں بااثر گروہوں نے علم کا نور عام کرنے میں مقدور سے زیادہ جد وجہد کی۔

شاہجہاں (حکومت: ۱۶۵۸-۱۶۲۸) اور اورنگ زیب کے دور حکومت میں دہلی میں ایک عالم دین سکونت پذیر تھے۔ یہ اپنی علمی فتوحات کی وجہ سے علما کے طبقے میں ایک متعارف شخص ہیں۔ ان کا نام ہے مولانا محمد یعقوب ولد حاجی یوسف بن مولانا شیخ محمد عباسی جو زہد و دیانت و تقویٰ کے ساتھ ساتھ درس و

تدریس، تصنیف و تالیف میں بھی مشغول کار رہے اور مدینہ منورہ سے آکر نیبان[۴] میں اقامت پذیر ہوگئے[۵] اور پھر لاہور منتقل ہوگئے۔

مولانا یعقوب لاہور میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت کا علم نہیں۔ ان کے اساتذہ کے اسمائے گرامی کا بھی کسی ذریعے سے پتہ نہیں لگ سکا، لیکن ظاہر ہے انہوں نے اپنے دور کے ممتاز اساتذہ سے علم حاصل کیا ہوگا۔

مولانا یعقوب کے ایک فاضل معاصر حبیب اللہ ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک حصہ بھی دہلی میں درس وتدریس میں گزرا تھا۔ یہ بھی صاحب تصنیف و تالیف ہیں۔ لغت نویسی سے دلچسپی تھی اس لیے ان کے معاصر انہیں نحوی کہتے تھے۔ مختلف شاہی عہدوں پر کام کیا تھا۔ محمد شاہ (حکومت ۱۷۴۸-۱۷۱۹) نے انہیں دہلی کے مقابر کا ناظم مقرر کردیا تھا۔ اسی دوران آپ نے دہلی میں مدفون ۲۰۹ علما و مشائخ کا تذکرہ ''ذکر جمیع اولیائے دہلی''[۶] لکھا۔ حبیب اللہ کی مولانا یعقوب سے ملاقات ہوئی یا نہیں اس کا علم نہیں ہوسکا۔ البتہ حبیب اللہ مولانا یعقوب کے لڑکے مولانا عبدالقدوس کے معاصر تھے اور ان سے مولانا کی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ حبیب اللہ نے مولانا یعقوب کے بارے میں چند ایسی اطلاع بہم پہنچائی ہیں جو مولانا کے بارے میں دیگر مآخذ میں نظر نہیں آتیں۔ ممکن ہے یہ اطلاع مولانا کے لڑکے مولانا عبدالقدوس نے حبیب اللہ کو فراہم کی ہوں۔ حبیب اللہ نے لکھا ہے کہ مولانا یعقوب نے عنفوان شباب میں تحصیل علوم کے شوق میں متعدد سفر کیے۔ اورنگ زیب کے دور سلطنت میں انہیں شاہزادہ سلطان محمد اور شاہزادہ محمد معظم کا اتالیق مقرر کیا گیا۔ داروغگی عدالت و وکالت شرعی ان سے منسوب رہیں۔

تعلیم سے فراغت کے بعد ان کے علمی تبحر کے پیش نظر شاہجہاں نے انہیں فوج کے میر عدل کے عہدے پر مقرر کیا اور مزید برآں مدرسہ شاہجہانیہ (جامع مسجد کے پہلو میں دارالبقا[۷]) کی مسند درس کی

---

[۴]۔ فقہائے ہند: ج۴، حصہ دوم، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۹ء، ص۳۶۷ پر بنانی، لاہوری لکھا ہے جو صحیح نہیں، یہ نیبان ہے۔

[۵]۔ حبیب اللہ، ذکر جمیع اولیائے دہلی، مرتبہ ذاکر و شریف حسین قاسمی، مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک ۱۹۸۸ء، ص۹۸۔

[۶]۔ راقم نے یہ تذکرہ مرتب کیا ہے جو مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک سے ۱۹۸۸ء میں شائع ہوچکا ہے۔ اسی ادارے نے دو سال قبل اسے دوبارہ شائع کیا ہے۔

[۷]۔ شاہجہاں کے معاصر مورخ محمد صالح کنبو نے عمل صالح: ج۳، ص۵۸ پر یہ اطلاع دی ہے کہ جامع مسجد کے عقب میں جنوب کی طرف دارالبقا (شاہی مدرسہ) اور شمال میں دارالشفا (ہسپتال) واقع ہیں۔

ذمہ داری بھی سونپ دی۔ مولانا نے بیس برس درس وتدریس کی یہ ذمہ داری نبھائی۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کی جگہ میرزا ابوالقاسم (م ،دوشنبہ ۲۴ربیع الآخر ۱۱۱۹ھ) اس مدرسے میں استاد مقرر ہوئے۔[8] بے شمار اصحاب علم نے ان سے استفادہ کیا۔ ان کو خاص طور پر حدیث میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ رزق اللہ نے اپنی کتاب ''الافق المبین فی اخبار المقربین'' کے طبقہ تاسعہ میں ان کی فراوانی علم و فضل کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''میں نے ان کو اثنائے درس میں دیکھا کہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی (م ۸ربیع الاول ۱۰۶۷/۱۶۵۶) پر شدید تنقید کرتے تھے۔''[9]

معاصر اور بعد کے مآخذ میں ان کو ان القاب سے یاد کیا گیا ہے:

> ملا محمد یعقوب، فاضل دانشمند، صاحب فطرت عالی، جامع معقول و منقول، اس کے علاوہ مولانا کے معاصر محمد صالح کنبو نے ''عمل صالح'' میں فخریہ انداز میں یہ اضافہ کیا ہے کہ مولانا ہندسہ، ہیئت اور اس فن کی جزئیات میں بھی طاق تھے۔ اسی طرح منطق و معانی کے میدانوں میں بھی اپنی تحقیقی کاوشوں سے جادو جگادیتے تھے۔ یہی محمد صالح مولانا محمد یعقوب نیانی کے بارے میں ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ مولانا! جو سرچشمہ فیض و محض خیر ہیں، پنجاب کی آبرو میں اضافہ کیا ہے اور اپنے معاصرین پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔[10]

مولانا محمد یعقوب نیانی نے اپنے آپ کو صرف درس وتدریس ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ تصنیف وتالیف پر بھی پوری توجہ دی۔ ان کی متعدد کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انہوں نے خاص طور پر درسی کتابوں پر حواشی لکھے۔ الخیر الجاری شرح صحیح البخاری، المعلم شرح صحیح الامام مسلم، المصفی شرح الموطا، شرح تہذیب الکلام، شرح حسامی، شرح شرعۃ الاسلام، علم صرف پر اساس العلوم، حاشیہ رضی، حاشیہ عضدی اور حاشیہ بیضاوی وغیرہ ان کی تصانیف کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان کی چند تصانیف کے خطی نسخوں کا راقم نے پتہ لگایا ہے۔ مثلاً بیضاوی پر حاشیہ اور شرح صحیح بخاری کے خطی نسخے مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ٹونک کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔[11]

شرح تہذیب الکلام لکھنؤ کے کتاب خانہ جنت مآب میں اور اسرار الاحکام جو امام زادہ کی شرعۃ الاسلام کی تفسیر ہے، کتاب خانہ خدابخش، پٹنہ میں موجود ہیں۔ مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،

---

[8]۔ ذکر جمیع اولیائے دہلی: حبیب اللہ، مرتبہ ذاکر و شریف حسین قاسمی، مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۳۔

[9]۔ فقہائے ہند: محمد اسحاق بھٹی، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور ۱۹۷۹ء (ج ۴، حصہ دوم، ص ۳۶۳)

[10]۔ عمل صالح: ج ۱، ص ۳۹۲۔

[11]۔ خزینۃ المخطوطات: ج ۱، مولانا محمد عمران خان مولانا آزاد عربک اینڈ پرشین ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ٹونک۔

خزینہ شیفتہ میں مولانا یعقوب کی شرح المنار کا ایک خطی نسخہ محفوظ ہے۔ یہ ابوالبرکات عبداللہ بن محمد معروف بہ حافظ الدین نسفی (م ۱۳۱۰/۷۱۰) کی اصول فقہ پر منار الانوار کی شرح ہے۔ آذری کی جواہر الاسراء پر مولانا یعقوب کے حاشیے کا ذکر سید جعفر صدر عالم ولد سید جلال صدر الصدور ولد سید مقبول جلال نے کیا ہے۔ یہ گجرات کے معروف خانوادہ علم و معرفت کے فرد تھے۔ یہ خاندان بھی نیبانی تھا۔ اسی خانوادے کے شیخ بدر عالم تیسری بار اپنے وطن نیبان گئے تو اس دوران انہوں نے جوامر الاسرار پر مولانا یعقوب کے حاشیے کا مطالعہ کیا تھا اس کا قلمی نسخہ جس پر بدر عالم کی یہ اطلاع مرقوم ہے، پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں محفوظ ہے۔ مولانا یعقوب کے بیضاوی پر حاشیے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کا مطالعہ بیضاوی پر دوسری کتابوں کے مطالعے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔[۱۲]

مولانا یعقوب کی جرأت ایمانی کی چند مثالیں یہاں پیش کرنی ہیں۔

بڑی دلچسپ بات ہے کہ علما نے دارا شکوہ کے الحاد پر جو محضر نامہ مرتب کیا تھا اور جسے بادشاہ وقت اورنگ زیب کی حمایت حاصل تھی، اس پر مولانا یعقوب نے دستخط کرنے اور اپنی مہر لگانے سے انکار کر دیا۔ بادشاہ کو معلوم ہوا۔ اس نے مولانا پر عتاب کیا اور کہا کہ صاحب علم و فضل علما نے اس محضر پر دستخط کر دیے۔ آپ نے اس پر مہر لگانے سے کیوں انکار کر دیا؟

مولانا کا جواب عدل اسلامی اور ان کی جرأت ایمانی کا ترجمان ہے۔ انہوں نے جواب دیا:

> جن حضرات نے اس محضر نامے پر دستخط کیے ہیں انہیں دارا شکوہ کے الحاد کا علم رہا ہوگا لیکن مجھے اس الحاد کا علم نہیں۔[۱۳]

کسی بھی مطلق العنان بادشاہ کو اس کی مرضی کے خلاف کسی بھی مسئلے میں جواب دینا، اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مولانا نے اس کی پروا نہیں کی۔

اب ایک دوسرا واقعہ:

> ایک قاضی صاحب تھے، عبدالوہاب۔[۱۴] یہ بھی اورنگ زیب کے ہی مقرر کردہ تھے۔ ایک بار اورنگ زیب ان سے ناراض ہو گیا۔ ہوا یہ کہ ایک ایرانی سبّ شیخین کے جرم میں گرفتار ہو گیا۔ یہ مقدمہ قاضی عبدالوہاب کی عدالت میں پیش ہوا۔ قاضی صاحب نے ایرانیوں کو پیغام بھیجا کہ

---

[۱۲]۔ فرحۃ الناظرین، ورق ۴۳،۷ (بحوالہ فقہائے ہند، ج ۵، حصہ اول)۔

[۱۳]۔ ذکر جمیع اولیائے دہلی، ص ۹۵۔

[۱۴]۔ یہ شیخ محمد طاہر پٹنی کے پیرہ تھے۔ بوہرہ قوم سے ان کا تعلق تھا۔ ۱۰۸۶ھ میں فوت ہوئے۔ معاصر تاریخوں میں ان کے احوال مرقوم ہیں۔ ار ک: اخبار الاخیار: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، ص ۲۷۲-۲۷۵، مآثر الامرا: ج ۱، ص ۲۳۵۔

اگر آپ حضرات مجھے چالیس ہزار فراہم کر دیں تو میں اس مجرم کا خون معاف کر دوں گا اور مقدمہ خارج کر دوں گا۔

ایرانیوں نے یہ غنیمت جانا اور چالیس ہزار روپے جمع کیے اور قاضی صاحب کو پیش کر دیے۔ جیسے ہی یہ روپے قاضی صاحب کو ملے، انہوں نے مجرم کے قتل کا حکم صادر کر دیا اور مجرم قتل کر دیا گیا۔ ایرانیوں نے اس معاملے کی پوری تفصیل سے بادشاہ وقت اورنگ زیب کو مطلع کر دیا اور بادشاہ قاضی صاحب سے ناراض ہو گیا اور انہیں عہدے سے معزول کر دیا۔ اس کے بعد بادشاہ نے یہ معاملہ مولانا یعقوب کے حوالے کر دیا کہ وہ اس سلسلے میں جائز و ناجائز کا فیصلہ صادر کریں۔

مولانا نے جواب دیا کہ میں اس قضیہ میں قضاءت کرنے کے لائق نہیں اور نہ ہی مجھے اس واقعے کا علم ہے۔ بادشاہ کو مولانا کی یہ بات پسند نہیں آئی۔ اب مولانا نے اس واقعے کی تحقیق شروع کی اور دریافت کیا کہ قاضی کو معزول کرنے کی وجہ کیا ہے؟

بادشاہ نے جواب دیا:

آپ میر عدل ہیں، کیا آپ نے نہیں سنا کہ قاضی نے ایرانیوں سے رشوت لی ہے اور پھر بھی مدعی علیہ کو قتل کرا دیا۔

مولانا یعقوب نے جواب دیا:

اس معاملے میں قاضی صاحب کے رویے کی تعریف و تحسین کی جانی چاہیے کہ اس نے دین کے دشمنوں کو قرار واقعی سزا دی۔ حقیقت کے منکر کو سزا دی اور اس کے معاونین پر مالی جرمانے کیے اور وہ رقم بیت المال میں داخل کرا دی۔ بادشاہ نے جب یہ صورت حال سنی تو اس کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور اس نے کہا: فی الواقع اگر اس (یعنی قاضی عبدالوہاب) نے ایسا کیا ہے تو کوئی جرم نہیں کیا۔ مولانا نے مزید عرض کیا کہ یہ دعا گو جو کچھ عرض کر رہا ہے وہ حقیقت ہے اور میر عدل ہونے کی وجہ سے دوسرا اس سے محروم ہے۔ بادشاہ نے قاضی عبدالوہاب کو خوش ہو کر خلعت سے نوازا۔[۱۵]

مولانا یعقوب کی جرأت ایمانی کا ایک اور واقعہ دیکھیے: پیدل فوج کے ایک گروہ کو برطرف کر دیا گیا۔ اس گروہ نے حق زحمت (یعنی تنخواہ) کے لیے مولانا یعقوب پر جو بادشاہ کے وکیل بھی تھے، قاضی عسکر کی عدالت میں برطرفی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ قاضی عسکر یہی مولانا یعقوب تھے۔ کیسی دلچسپ لیکن پیچیدہ صورت حال پیش آگئی۔

اس طرح یہ دعویٰ خود حکومت اور بادشاہ کے خلاف تھا۔ مولانا یعقوب نے معاملے سے متعلق

---

[۱۵] ذکر جمیع اولیائے دہلی، ص ۱۰۰۔

کاغذات کا مطالعہ کیا۔ دفتر سے بھی تحقیق کرائی اور دعویٰ کرنے والے کے حق کا اقرار کیا اور اسی کے مطابق اقرار نامہ انہیں جاری کر دیا۔ انہیں بقایا رقم مل گئی۔ تنخواہ کے وقت دیوان اعلیٰ کی رپورٹ سے یہ معاملہ بادشاہ کی دانست میں آیا کہ خود ان کے وکیل مولانا یعقوب کے اقرار کے بموجب معطل سپاہیوں کی تنخواہ دے دی گئی ہے۔ بادشاہ نے ظاہر ہے مولانا یعقوب کو بلایا اور کہا:

میرے وکیل ہونے کا آپ نے کیا خوب حق ادا کیا ہے۔ حکومت کی کوتاہی کا اقرار کر لیا۔

اب مولانا یعقوب کے استدلال کو دیکھئے، مولانا جواب دیتے ہیں کہ بادشاہ سلامت! یہ دعا گو دینی خیر خواہ ہے۔ سپاہیوں کا دعویٰ قبول نہ کرنا مضر ہوتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت آپ اس حالت میں ہیں اور یہ قدرت آپ کو حاصل ہے کہ مدعیوں کا حق ادا کر دیں۔ اگر میں اقرار نہ کرتا تو کل قیامت کے روز اللہ تعالیٰ جہاں پناہ کے حسنات مین سے ان مدعیوں کا حق دلوا دیتا۔ حق آگاہ بادشاہ اس دلیل سے خوش ہوا۔[۱۶] یہ تھا مولانا کا تبحر علمی اور جرأت اظہار حق و انصاف۔

یہ بحث ختم کرنے سے پہلے اورنگ زیب کا ایک حکم نقل کرنا بے جا نہیں۔ ملاحظہ فرمائیے کہ اس نے جیسا کہ مذکورہ قضیے سے معلوم ہوتا ہے، کس طرح مکمل طور پر اپنے اس حکم کی جزئیات کی پاسداری کی۔ اس نے اعلان کرایا تھا: اگر کوئی شخص یہ سمجھے کہ بادشاہ کی طرف سے کسی معاملے میں حق تلفی ہوئی ہے یا بادشاہ نے غیر شرعی اقدام کیا ہے۔ تو وہ بلا تامل عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ اس کو بادشاہ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا پورا حق ہے۔ بادشاہ نے یہ حکم بھی جاری کیا کہ: رعایا کے نادار اور غریب لوگ مراحل تحقیق کے مصارف ادا کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اس لیے شرعی وکیل مقرر کر دیے جائیں جو اس قسم کے مقدمات کی تحقیق میں ان کی پوری مدد کریں۔[۱۷] بالفاظ دیگر بادشاہ پر یہ نالش کا حق تھا جو اس نے ملک کی رعایا کے ہر فرد کو دے دیا تھا۔

مولانا یعقوب کی تاریخ وفات ۱۰۹۴ھ یا ۱۰۹۲ھ ہے۔[۱۸] یہ اپنی مسکونی حویلی میں دفن کیے گئے جو نیا بانس میں گلی تہور خان میں واقع تھی۔ ان کے لڑکے مولانا عبدالقدوس نے اس حویلی میں سات ہزار روپے کی لاگت سے ایک مسجد تعمیر کرادی تھی۔ مولانا عبدالقدوس اسی مسجد میں مشغول تدریس رہے۔ یہ کچھ عرصے دارالخلافے کی عدالت کے داروغہ بھی تھے اور کچھ زمانے تک دہلی کی سوانح نگاری کی ذمہ

---

[۱۶] ۔ذکر جمیع اولیائے دہلی، ص ۹۸۔

[۱۷] ۔فقہائے ہند، ج ۵، حصہ اول، مقدمہ، ص ۱۷۔

[۱۸] ۔ذکر جمیع اولیائے دہلی میں آپ کی تاریخ وفات ۱۰۹۶ھ درج ہے اور نزہۃ الخواطر: ج ۶، ص ۱۵۹ میں یہ تاریخ ۱۰۹۸ھ مرقوم ہے۔ (بحوالہ فقہائے ہند، ج ۴، ص ۳۶۴۔

داری بھی ان کے سپر د رہی۔ یہ ۱۲۴ اھ یا ۱۱۳۱ھ میں فوت ہوئے اور اپنے والد کے پہلو میں دفن کیے گئے۔ مولانا یعقوب کی قبر اسی مسجد کے صحن میں حوض کے عقب میں واقع ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مولانا یعقوب کی قبر مسجد میں ایک دیوار کے نیچے ہے۔ راقم نے یہ قبر دیکھی ہے۔ مسجد کا صحن وسیع رہا ہوگا۔ مسجد سے ملحق جب کسی نے اپنا مکان تعمیر کرایا تو مسجد کے صحن کے کچھ حصے پر قبضہ کر لیا اور مسجد کے صحن مین جو دیوار تعمیر کرائی اس میں مولانا کا مزار آرہا تھا۔ اس لیے وہاں دیوار میں مولانا کی قبر پر ایک چھوٹی اور پست محراب بنوادی اور اس پر دیوار تعمیر کرادی گئی۔[19]

[19]۔ والد کی طرح مولانا عبدالقدوس کے سال وفات میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ تاریخ محمدی، ص ۴۰ میں سال وفات پنجشنبہ، ۱۱ ربیع الاول ۱۱۳۱ھ (رضوان المآب) لیکن ذکر جمیع اولیائے دہلی، ص ۱۰۱ میں ۱۱۲۴ھ مرقوم ہے۔

پروفیسر حمیداللہ خاں عرشیؔ

راجپوتانہ کی ایک اہم شخصیت

ڈاکٹر معین الدین شاہین

ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، سمراٹ پرتھوی راج چوہان گورنمنٹ کالج، اجمیر (راجستھان)

mdazadfazil1966@gmail.com

حمیداللہ خاں عرشیؔ کے احوال وآثار پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا احترام الدین احمد شاغلؔ رقم طراز ہیں کہ:

عرشیؔ تخلص، محمد حمیداللہ خاں نام، نسباً یوسف زئی افغان، والدِ بزرگوار کا نام سبحان خاں تھا۔ وطن جے پور۔ میر حیدر حسن زکیؔ ویکتاؔ سے تلمذ تھا۔ اُن کی خدمت میں خط کی مشق کرنے کو حاضر ہوا کرتے تھے، اسی سلسلے میں شعر وسخن کا شوق ہوا تو انہیں سے تلمذ اختیار کیا۔

شخصیت: باوجود یہ کہ آپ کے خاندان میں علم کا فقدان تھا مگر آپ نے اپنے شوق سے پڑھا۔ مہاراجہ اورینٹل کالج جے پور سے منشی فاضل پاس کیا۔ پھر انگریزی تعلیم حاصل کر کے ایم-اے کیا۔ عربی کی استعداد معقول بھی حاصل کی۔ ذوقِ کتب بینی سے مبلغ علم بہت بلند کر دیا۔ گورنمنٹ کالج اجمیر میں پر شین پروفیسر ہو گئے۔ نہایت نیک نام زندگی بہت عشرت سے بسر کی۔ اجمیر میں آنریری مجسٹریٹ بھی رہے...پنشن لینے کے کچھ عرصہ بعد جے پور آگئے تھے اور یہیں مستقل طور پر سکونت پذیر تھے۔[1]"

مولانا شاغلؔ نے اگرچہ مذکورہ اقتباسات میں عرشیؔ سے متعلق اہم معلومات فراہم کرائی ہیں لیکن وہ اس وضاحت سے قاصر رہے کہ عرشیؔ کی ولادت کب اور کہاں ہوئی۔ ہو سکتا ہے انہوں نے بھی راقم الحروف کی طرح ہی اس سلسلے میں تگ ودو کی ہو لیکن کوئی کارآمد حوالہ ہمدست نہیں ہوا ہو۔ گورنمنٹ کالج اجمیر کی میگزین کے شماروں میں عرشیؔ سے متعلق اردو اور انگریزی میں مضامین شائع ہوئے لیکن اُن کی ولادت کے سلسلے میں وہاں بھی خاموشی ہے۔

عرشیؔ کی سندی تعلیم کے متعلق وضاحت کرتے ہوئے مولانا شاغلؔ نے انہیں منشی فاضل اور ایم-اے کا سند یافتہ بتایا ہے لیکن گورنمنٹ کالج اجمیر کی میگزین کے شماروں میں اُن کے نام کے ساتھ

---

[1] ۔ تذکرہ شعرائے جے پور"، مرتب مولانا احترام الدین احمد شاغلؔ، ص ۳۳۱، ۳۳۲، ناشر انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۸ء

ایل-ٹی، ایچ-پی اور ایچ-اے کا اضافہ بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ عرشیؔ نے اپنی تعلیم ختم کی تو انہیں روزگار کی فکر ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں خان بہادر سید عبدالوحید چشتی (پروفیسر شعبۂ فارسی) گورنمنٹ کالج اجمیر کا تقرر میئو کالج، اجمیر میں ہو جانے پر شعبۂ فارسی کی پروفیسر شپ کے تحت ۱۹۱۳ء میں حمید اللہ خاں عرشیؔ کا تقرر عمل میں آیا۔ انہوں نے اس عہدے پر ۲۹ برسوں تک اپنی خدمات انجام دیں اور یکم جون ۱۹۴۲ء کو اس عہدے سے سبکدوش ہو کر پنشن یاب ہوئے۔

عرشیؔ صاحب کی سبکدوشی کے موقع پر اُن کے اعزاز میں شایان شان تقریبات کا انعقاد کیا گیا جہاں کالج کے اساتذہ و طلبہ نے اُن سے متعلق تقریری اور تحریری طور پر اظہارِ خیال کیا۔ چونکہ عرشیؔ کا شمار ہر دلعزیز شخصیات میں ہوتا تھا، اس لئے گورنمنٹ کالج کی میگزین بابت یکم مارچ ۱۹۴۲ء میں ایڈیٹوریل ریویو کے زیر عنوان یہ تحریر کیا گیا کہ:

> مولوی حمید اللہ خاں یوسف زئی امسال یکم جون کو اپنی ملازمت سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ چونکہ اُن کی سبکدوشی گرمی کی تعطیلات میں ہو گی اس لئے ہم انہیں ۲۷ اپریل کو خدا حافظ کہہ دیں گے۔ انہوں نے اس ادارے میں اپنی ۲۹ سالہ خدمات انجام دی ہیں۔ اُن کی شخصیت نہایت متاثر کن ہے۔ انہوں نے اس ادارے کے لوگوں کے ساتھ اہل خانہ جیسا سلوک کیا۔ اُن کا تقرر ۱۹۱۳ء میں اس کالج کے پروفیسر شعبۂ فارسی کے طور پر ہوا تھا۔ تب سے آج تک طلبہ کی رہبری اور رہنمائی کا فریضہ انہوں نے انجام دیا۔ انہوں نے کالج ہاسٹل کا سپرنٹنڈنٹ رہتے ہوئے طلبہ کے ساتھ پدرانہ سلوک کیا جس کے لئے وہ ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ وہ مہذب، مؤدب، مخلص اور بااخلاق انسان ہیں۔ آپ کے تعلقات خاندانِ مغلیہ اور نوابین اودھ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد سے نہایت خوشگوار رہے ہیں۔ بے حد شیریں اور نفیس اردو بول کر سب کو اپنا گرویدہ بنالیتے ہیں، اور آزادانہ طور پر ہر مکتبۂ فکر کے حضرات کے ساتھ نہایت شائستگی سے پیش آتے ہیں۔ چہرے پر ہمیشہ تبسم کی لکیریں دوڑتی رہتی ہیں۔ اردو اور فارسی تہذیب کی نمائندگی آپ کی شخصیت کے نمایاں اور روشن پہلوؤں میں ہے۔
>
> آپ اپنے شاندار ماضی اور اس کے تہذیبی رکھ رکھاؤ نیز ادب وآداب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی تعریف وتوصیف چند الفاظ یا جملوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ آپ ایک زندہ دل اور بذلہ سنج شخص ہیں۔ لطیفہ گوئی اور لطیفہ سازی میں مہارت رکھتے ہیں، لیکن ہنسی مذاق کے دوران بھی تہذیبی روایت اور اقدار کا دامن نہیں چھوڑتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ لطیفہ گوئی کے دوران خود کو نشانۂ ہدف بنالیتے ہیں۔ جو لوگ اُن سے ملاقات کرتے ہیں وہ خوشی خوشی لوٹتے ہیں۔ آپ ہر رنگ میں خود کو ڈھالنے کا ہنر جانتے ہیں تاہم کالے، ہرے اور گلابی پاپوش انہیں مرغوب ہیں۔ ہر قوم وملت سے تعلق رکھنے والے حضرات کا احترام کرتے ہیں۔ اپنے رفقائے کار کے ساتھ آپ کا سلوک ہمیشہ برادرانہ اور مشفقانہ ہوتا ہے، اپنے طلبہ سے اُن کی پدرانہ شفقت جگ

ظاہر ہے ہی، اُن کی تعلیم تربیت اور کیریئر کے لئے ہمیشہ متفکر رہتے ہیں۔ یہ ایسے اوصاف ہیں جن کے سبب مولوی حمید اللہ خاں یوسف زئی کو پسند کیا جاتا ہے۔

کالج کے طلبہ نے یہ پیش کش کی ہے کہ وہ مولوی صاحب کی سبکدوشی کے موقع پر مارچ کے ماہ میں اُن کے شایانِ شان الوداعیہ تقریب آراستہ کریں گے۔ ہم مولوی صاحب کی ہمیشہ صحت یابی، تندرستی، سلامتی اور مسرت و شادمانی کے لئے دعاگو ہیں۔ اور کالج کے اساتذہ و تلامذہ کی جانب سے انہیں نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔ کالج کے اسٹاف کی یہ دلی خواہش ہے کہ مولوی صاحب کی ایک قلمی تصویر بنوا کر کالج میں آویزاں کی جائے تاکہ وہ سدا ہماری یادوں میں رچے بسے رہیں۔[۲]

گورنمنٹ کالج، اجمیر کے طلبہ نے مارچ ۱۹۴۲ء میں عرشیؔ سے متعلق ایک الوداعیہ تقریب کے انعقاد کی تیاری کی تھی، جو اپنے طے شدہ پروگرام کے مطابق انعقاد پذیر ہوئی جس میں طلبہ نے عرشیؔ صاحب سے متعلق اپنے جذبات واحساسات کا اظہار کیا۔ اسی تقریب میں طلبہ کی نمائندگی کرتے ہوئے بی-اے فائنل کے طالبِ علم سید محمد شفیع چشتی انجمؔ نے اپنا مختصر و جامع مضمون بعنوان ''مولانا حمید اللہ خاں صاحب یوسف زئی'' پیش کیا جو بعد ازاں کالج میگزین میں بھی شائع ہوا۔ چونکہ اس مضمون میں بعض ایسی معلومات فراہم کی گئی ہیں جو دیگر حوالوں سے موصول نہیں ہوتیں اس لئے اس مضمون کی تلخیص یہاں پیش کی جارہی ہے:

گورنمنٹ کالج اجمیر سے مولانا حمید اللہ خاں یوسف زئی کے ریٹائر ہو جانے سے کالج میں ایک ایسی علم دوست ہستی کی کمی واقع ہوئی جو کبھی نہیں بھلائی جاسکتی۔ کالج کے اساتذہ اور طلبہ کا خوشگوار فرض ہے کہ آپ جیسے کامل استاد پر نازاں ہوں۔ وہ ایک جامع حیثیت شخص ہیں۔ عربی اور فارسی کے جید عالم ہونے کے علاوہ اردو زبان پر اُن کی وسیع نظر ہے۔ اعلیٰ درجے کے نثار ہیں اور شعر بھی خوب کہتے ہیں ۔ عرشیؔ تخلص فرماتے ہیں۔ آپ طلبہ میں ایسا ذوق و تجسس پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ اپنا رستہ خود نکال لیتے ہیں۔ آپ کی تحریر اور تقریر عاشقانِ علم وادب کے لئے نمونہ ہوتی ہے۔ لفظوں کی تلاش یا نئے الفاظ بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔ لفظ ایسے جلد اور موزوں بناتے ہیں کہ گویا ان کے دماغ سے الفاظ ڈھلتے چلے آرہے ہیں۔ باتیں کرتے وقت ان کی زبان کی روانی اور ان کے موزوں اور مرصع الفاظ کی نشست سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی بے تکلف گفتگو بھی ادبی تحریر سے کم دلآویز نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا جیسی عظیم الشان شخصیت اس قحط الرجال کے زمانہ میں خدائے تعالیٰ

---

[۲]۔ دی گورنمنٹ کالج میگزین''، گورنمنٹ کالج اجمیر، ص ۱، بابت یکم مارچ ۱۹۴۲ء

کی دی ہوئی نعمت عظمیٰ ہے۔ قدرت نے وہ ذہانت و فراست عطا کی ہے کہ جو کم لوگوں کے حصہ میں آئی ہے۔ طبیعت میں بے ساختگی اور روانی کا یہ عالم ہے کہ گویا ایک بڑا دریا ہے کہ جس میں موجوں کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوتا۔ ادب، فلسفہ، تاریخ، جغرافیہ، اسلام اور دیگر علوم میں انہیں کامل دسترس حاصل ہے۔ مولانا کے وہ نوٹس جو طلبہ کو کالج میں لکھائے ہیں، معلومات کی انسائیکلوپیڈیا معلوم ہوتے ہیں۔ موقع و محل کی مناسبت سے برجستہ مصرعہ یا شعر پڑھ کر طلبہ کے دل و دماغ کو حاضر و تروتازہ رکھنا مولانا کا مخصوص طریقۂ تعلیم ہے۔ اس سے طالب علم کو نہ صرف درسی کتابوں سے بلکہ بڑے بڑے ادیبوں (کذا) کے کلام کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے اور اعلیٰ قسم کا ادبی ذوق دل و دماغ کو روشن کر دیتا ہے۔ بڑے بڑے اہم پیچیدہ حقائق اور ادق مسائل کو بڑی خوبصورتی اور سلاست سے مؤثر، دل نشیں اور قریب الفہم بنا دیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا حمید اللہ خاں صاحب ایسی جلیل القدر اور یگانۂ روزگار ہستی ہیں کہ جن کی شاگردی کا شرف حاصل ہونا خدائے تعالیٰ کی ایسی نعمتِ غیر مترقبہ ہے جس پر جتنا بھی ناز کیا جائے کم ہے۔ ہمارے لئے مولانا کی صحبت آغوشِ ادب سے کم نہ تھی۔[۳]

یہ تحریر صاف مرزا فرحت اللہ بیگ کی انشاء پردازی سے متاثر معلوم ہوتی ہے جس میں انجمؔ نے بھی ''نذیر احمد کی کہانی: کچھ ان کی کچھ میری زبانی'' جیسا ہی اسلوب اور اندازِ تخاطب اختیار کیا ہے۔ مزید لکھتے ہیں کہ :

آگرہ یونیورسٹی کے امتحان میں اردو کا شامل ہونا مولانا ہی کی کوشش، ایثار اور قربانیوں کا رہینِ منت ہے۔ مولانا کی دیگر ادبی خدمات اور ادب پروری کے ساتھ ساتھ مولانا کی یہ خدمت بھی اردو ادب میں بڑی قدر و قیمت سے دیکھی جائے گی۔

جامعہ عثمانیہ کی تعلیمی کونسل میں جب مسئلہ پیش ہوا کہ آزاد کے بعد اردو ادب کی کرسی کس کو دی جائے تو بالاتفاق یہ طے ہوا کہ بجز مولانا حمید اللہ خاں کے اور کوئی اس کا اہل نہیں ہے۔

مولانا کے مزاج میں سادگی اور استغنا ہے۔ جاہ و حشمت کے طالب نہیں ہیں۔ آپ بڑے متواضع اور خلیق انسان ہیں۔ جس سادگی، خلوص اور محبت سے پیش آتے ہیں اُس کی قدر و قیمت صرف وہی جان سکتے ہیں جن کا اُن سے واسطہ پڑا ہے۔ آپ کسی کو ناراض نہیں ہونے دیتے۔ خود خوش رہتے ہیں اور اوروں کو بھی خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ خوب باتیں کرتے ہیں اور ہنستے ہیں اور ہنساتے ہیں۔ مولانا میں اُس خلوص اور محبت کی بو آتی ہے جسکے قصے ہم نے بزرگوں سے سنے ہیں۔ مولانا ایک زبردست عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عابد، متقی اور پرہیز گار بھی ہیں۔

۳۔ دی گورنمنٹ کالج میگزین''، گورنمنٹ کالج اجمیر، ص ۷، بابت یکم مارچ ۱۹۴۳ء

آپ فقراء اور بزرگانِ دین سے خاص دلچسپی رکھتے ہیں یہ ذوقی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔ شعرائے متصوفین سے آپ کو قلبی لگاؤ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم جس بزرگ ہستی کے متعلق یہ سطریں لکھ رہے ہیں، ایک ایسی جلیل القدر اور نادرالوجود ہستی ہے جو نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ کالج کے تمام اساتذہ اس جوہر قابل کو آنکھوں میں جگہ دیتے ہیں۔ مولانا کا کالج میں ہونا طلبہ کے لئے شفقت پدری سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ مولانا ہم سے ایسے وقت میں جدا ہوئے ہیں جبکہ ہمیں ان کی سخت ضرورت تھی[۴]۔

بقولِ شاغلؔ مرحوم عرشیؔ کو میر حیدر حسن زکیؔ ویکتاؔ سے تلمذ تھا۔ واضح ہو کہ میر حیدر حسن بذاتِ خود اُن قابل قدر شخصیات میں شامل تھے جنہیں علم و ادب میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ عرشیؔ نے اپنی تعلیم و تربیت کے دوران جے پور میں میر حیدر حسن زکیؔ کی سرپرستی میں عمدہ عمدہ تخلیقات پیش کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس لئے رفتہ رفتہ اُن کی ادبی پہچان قائم ہونے لگی۔ مولانا شاغلؔ نے یہ لکھا ہے کہ انہیں بہ مشکل تمام عرشیؔ کے صرف مندرجہ ذیل اشعار میسر آئے ہیں۔

اور سب کچھ تو ہے اے گردشِ دوراں ہونا
کبھی ممکن نہیں صبحِ شبِ ہجراں ہونا
گو نہیں شوقِ شکار اُن کو مگر کیا کیجے
دل کو خود ہی ہدفِ ناوکِ مژگاں ہونا
تم نہ چاہو تو ہے دشوار، اگر تم چاہو
کچھ بھی مشکل نہیں، مشکل میری آساں ہونا

واضح ہو کہ راقم الحروف کو عرشیؔ کا کلام بزبانِ فارسی و اردو موصول ہوا جسے ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

غزل فارسی

جلوۂ محمل نشینے درد بودہ دل مرا
جاں پئے جاناں برفت و دل پئے محمل مرا
غازۂ لولاک افزودہ جمالِ عارضش
شمع حسنش عالم آرا گشتہ در محفل مرا

---

[۴] دی گورنمنٹ کالج میگزین''، ایضاً، ص ۸

بیکسی بیچارگی تعبیر خواب ہستیم
یاس وحرماں دور دور انداخت از ساحل مرا
بستیگہارا کشود از دستِ تو اندر جہاں
دستی از رحمت کشا شد کار ہا مشکل مرا
اے کہ خاکِ پائے تو درمانِ دردِ بیکساں
کن مداوائے کہ دروے ہست اندر دل مرا
ہمچو قمری طوق در گردن نہادہ عالمے
ہمچولالہ داغہا افتادہ اندر دل مرا
زلف عنبر بوئے تو آشفتہ گرداند دلم
تیغِ ابروئے تو دارد خستہ وبسمل مرا
عرش نازد از خرامِ ناز تو اے نازنیں
بخت عرشیؔ چوں نہ نازد گر شوی حاصل مرا

غزل اردو

خطر ہے برق کا ڈر باغباں کا
خدا حافظ ہمارے آشیاں کا
نہیں شکوہ جفائے آسماں کا
مجھے رونا ہے ابنائے زماں کا
اٹھاتی ہے نئے ہر روز فتنے
زمیں کرنے لگی کام آسماں کا
ریا سے رندی ومستی ہے بہتر
بجا ارشاد ہے پیرِ مُغاں کا
کلیسا میں، حرم میں ، بتکدے میں
نہیں کوئی بھی مجھ بے خانماں کا
مقدر شیخ لے پہنچا حرم میں
یہاں تو قصد تھا کوئے بُتاں کا
عدُو پر پہلے خنجر آزمالو
ارادہ ہے جو میرے امتحاں کا

قفس میں اے اسیرانِ قفس تم
نہ پوچھو حال مجھ بے آشیاں کا
اگر گریہ یہی، نالے یہی ہیں
خدا حافظ زمین وآسماں کا
سلاست گم فقط لفاظیاں ہیں
خدا حافظ ہے اب اردو زباں کا
کہیں کیوں کر نہ مجھ کو لوگ عرشیؔ
کہ ہوں جاروب کش اُس آستاں کا

غزل گوئی کے علاوہ عرشیؔ کو نظم نگاری میں بھی قدرت حاصل تھی۔ اُن کی ایک بلاعنوان نظم تعلیمی حلقوں میں خاصی مشہور ہے۔ جو گورنمنٹ کالج، اجمیر کی صد سالہ تقریب (۱۹۳۶ء) کے موقع پر کہی گئی تھی۔ یہ نظم اگرچہ ایک تعلیمی ادارے کی تعریف میں تخلیق ہوئی ہے لیکن اس میں فارسی اور اردو قصیدہ نگاری کا سا اندازِ بیان جلوہ نما ہے، ذیل کے اشعار کے حوالے سے اس امر کی بخوبی عکاسی ہوتی ہے :

دامنِ دل کھینچتی ہے آج کالج کی بہار
ہیں مواسا جس کے یاں پر جلوہ فرما بے شمار
ہے مبارک ایسی قابل ہستیوں کا اجتماع
جن کی عظمت سے ہوا ہے جشنِ کالج شاندار
پیارے کالج عہدِ صد سالہ کی تو تصویر ہے
تجھ میں رنگت حکمت وسائنس کی ہے آشکار
رُخ تیری تصویر کا اٹھارہ سو چھتیس میں
بن گیا اجمیر کی صورت گری کا شاہکار
سن میلادی اور اب اُنّیس سو سینتیس میں
جشن صد سالہ ہوا ہے کار فرما نامدار
تیری چوکھٹ پر فدا ہوتا ہے ہر پیر و جواں
راجپوتانہ میں تو ہے درس گاہِ با وقار
تیری گویائی سے ہیں گویا زبانیں خلق کی
تیرے لکچر سے بہت سے بن گئے ہیں لیکچرار

کچھ ہمیں بھی داستاں سو سال پہلے کی سنا
جب نہ تھی دشوار اتنی زندگی کی کارزار
تیرے ابرِ فیض سے سرسبز کشتِ زندگی
ہو رہے ہیں تجھ سے مالامال سب اغیار و یار
تیرے پہلو میں رواں ہے چشمۂ آبِ حیات
زندگی پائی ہے جس نے اس کو چکھا ایک بار
تجھ پہ لہراتا رہے جھنڈا حکومت کا سدا
جیسے ہو بالِ ہما زیبِ کُلاہِ تاجدار
خسروِ علم و ہنر ! نکہت تیرا دربار ہو
اِس میں گنگا فیض کی بہتی رہے لیل ونہار
تیرے گہوارے میں پائیں پرورش چھوٹے بڑے
دل سے عرشیؔ کے نکلتی ہے دعا یہ بار بار

یہ نظم اپنے موضوع و مفہوم کے لحاظ سے اتنی مقبول ہوئی تھی کہ اس کے انگریزی، ہندی اور سنسکرت زبانوں میں بھی تراجم کیے گئے تھے۔ قصیدہ گوئی کا ایک رنگ عرشیؔ کی اُس تخلیق میں بھی موجود ہے۔ جو ۱۹۳۵ء میں جارج ففتھ اور اُن کی بیگم کی سلور جوبلی کے موقع پر ایک شاندار مشاعرے میں پڑھی گئی تھی، اُس کے صرف تین چار اشعار ملاحظہ فرمائیے :

تاجدارِ ذی حشم، شاہنشہِ گردوں ختم
جملہ سلطانانِ عالم، بردرش مثلِ خدم
ہز میجسٹی جارج پنجم قیصرِ اقلیمِ ہند
فیض اُو در ہند آمد، مایۂ لطف وکرم
نو بہارِ گلشنِ دولت گلِ باغِ جہاں
مہر دنیائے معارف، ماہِ دنیائے حکم
میکند عرشیؔ دعا، ہموارہ از قلبِ صمیم
چرخ بادا چاکرش، اقبال ودولت سر بخم

شعر گوئی کے علاوہ حمید اللہ عرشیؔ کو میدانِ نثر میں بھی مستقل کتابوں اور مضامین و مقالات کے پیش نظر قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ اُن کے چند ایسے مضامین گورنمنٹ کالج، اجمیر کی میگزین میں شائع ہوئے جو دعوتِ فکر و عمل دیتے ہیں، جیسے :

(۱) اردو زبان کی ارتقائی منزلیں مشمولہ گورنمنٹ کالج، اجمیر میگزین، دسمبر ۱۹۳۲ء
(۲) دُوئی کے دلفریب نظاروں کی حقیقت مشمولہ ایضاً، اکتوبر ۱۹۳۴ء
(۳) ایک تندرستی ہزار نعمت مشمولہ ایضاً دسمبر ۱۹۳۷ء
(۴) اردو زبان کی لسانیات پر ایک نظر مشمولہ سوینئر ۱۹۳۶ء گورنمنٹ کالج اجمیر، سینچری میگزین

معلوم ہوتا ہے کہ حمید اللہ خاں عرشیؔ کی لسانیات میں خاصی دلچسپی تھی۔ لسانیات کے علاوہ ترجمہ نگاری اور تذکرہ نویسی بھی سے شغف تھا۔ اُن کی مشہور کتابیں ''کلام الملوک'' اور ''لسان و مطالعہ ٔلسان'' اپنے موضوع و مفاہیم کے پیش نظر آج بھی اہمیت وافادیت کی حامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں یونیورسٹیز کے نصاب میں بھی شامل رہیں۔ ''لسان و مطالعہ ٔلسان'' ۱۹۲۱ء میں انڈین پریس، الٰہ آباد سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا احترام الدین شاغلؔ نے سہواً اس کا عنوان ''لسان و مطالعہ ٔزبان''[۵] تحریر کیا ہے۔ یہ کتاب انگریزی کے ماہر لسانیات پروفیسر ڈبلیو-ڈی-ہوٹنی کی کتاب کا ترجمہ ہے جسے پروفیسر عرشیؔ نے طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کے لئے پیش کیا۔ اس کتاب کے متعلق سید محمد شفیع چشتی انجم نے لکھا ہے کہ :

> اُن کی کتاب لسان و مطالعہ ٔلسان ایک حد تک ان کی وسعت نظری، تجربہ ٔعلمی اور عرق ریزی کی شاہد ہے۔ اس میں جو زرّیں اصول ''لسان'' و ''نکاتِ لسان'' بیان کیے گئے ہیں وہ ادبی ذوق رکھنے والوں کے لئے مشعلِ ہدایت کا حکم رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ زبانِ اردو کو اس قسم کی جامع کتاب کی سخت ضرورت تھی۔ یہ مولانا کی اردو کے ساتھ ایسی بیش بہا خدمت ہے جو کبھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔[۶]
>
> ''کلام الملوک'' کی طباعت ۱۹۳۲ء میں مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ کے زیر اہتمام عمل میں آئی تھی۔ اس کتاب میں سلاطینِ تیموریہ کے شہزادگان کا کلام یکجا کیا گیا ہے۔ آخر میں متعلقہ شعرائے کرام کے مختصر سوانحی حالات بھی سپردِ قلم کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب حوالہ جاتی مواد میں امتیازی اہمیت کی حامل ہے۔ عرشیؔ مرحوم کی دیگر کتابوں کے متعلق مولانا شاغلؔ نے یہ لکھا ہے کہ ''غیر مطبوعہ یقیناً متعدد کتابیں ہوں گی۔ مگر آپ کے ورثاء کی باہمی مقدمہ بازی نے خدا جانے اُن کا کیا حشر کیا۔[۷]

بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب ''جائزہ زبانِ اردو، حصہ اول-ریاست ہائے راجپوتانہ'' میں

---

[۵] ۔تذکرہ شعرائے جے پور''، ص ۳۳۲
[۶] ۔دی گورنمنٹ کالج میگزین''، اجمیر، ص ۸، بابت مارچ ۱۹۴۳ء
[۷] ۔تذکرہ شعرائے جے پور''، ص ۳۳۲

مذکورہ دونوں کتابوں کے سنینِ اشاعت کے سلسلے میں احتیاط نہیں برتی۔ انہوں نے ''لسان و مطالعہٴ لسان'' کا سن طباعت ۱۹۲۸ء[۸] اور ''کلام الملوک'' کا ۱۹۳۱ء[۹] لکھا ہے۔ علاوہ ازیں عرشیؔ سے انہوں نے ایک اور کتاب بعنوان ''قواعدِ اردو'' مطبوعہ ۱۹۳۴ء[۱۰] کو منسوب کیا ہے لیکن دیگر کسی حوالے سے بھی اس کتاب کی طباعت کا علم نہیں ہوتا۔ عرشیؔ پر لکھے گئے مضامین بھی اس سلسلے میں خاموش ہیں۔

حمید اللہ عرشیؔ کے کسی قدر حالات مولانا احترام الدین شاغلؔ نے اپنے تذکرے میں مرقوم کیے ہیں۔ عرشیؔ کی وفات کے سلسلے میں انہوں نے لکھا ہے کہ ''جے پور میں ۲۶، دسمبر ۱۹۲۱ء کو وفات پائی اور مولانا ضیاء الدین کے گورستان میں سپردِ خاک ہوئے۔[۱۱]''

واضح ہو کہ عرشی یکم جون ۱۹۴۲ء کو گورنمنٹ کالج، اجمیر کی ملازمت سے سبکدوش ہوئے تھے اور گورنمنٹ کالج، اجمیر کی میگزین اپریل ۱۹۴۷ء سے یہ اطلاع ملتی ہے کہ حمید اللہ خاں عرشیؔ کے نام سے ''والی بال ٹرافی''[۱۲] منسوب کی گئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ عرشیؔ کا انتقال ۱۹۲۱ء میں تو قطعی نہیں ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو۔ گورنمنٹ کالج، اجمیر کے پرانے ریکارڈوں اور دستاویزات کی ورق گردانی ان دنوں راقم کی خصوصی توجہ کا مرکز ہے اگر کوئی مستند حوالہ دستیاب ہوتا ہے تو اُسے آئندہ کسی تحریر میں جگہ دی جائے گی۔

۸۔ ''جائزہ زبان اردو'' مولوی عبدالحق، ص ۳۲۲، انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی ۱۹۴۰ء

۹۔ ایضاً، ص ۳۲۳،

۱۰۔ ایضاً

۱۱۔ تذکرہ شعرائے جے پور''، ص ۳۳۲

۱۲۔ دی گورنمنٹ کالج میگزین''، اجمیر، ص ۲۱، بابت اپریل ۱۹۴۷ء

شاہ منیر عالم غازی پوری اور علامہ شبلی پر ''مسلم ریویو'' میں شائع شدہ ان کا مضمون

پروفیسر ظفرالاسلام اصلاحی

zafarul.islam@gmail.com

کچھ عرصہ قبل ''شذراتِ سلیمانی'' (معارف کے اداریوں کے مجموعہ) کی ورق گردانی کرتے ہوئے مشرقی یوپی کے معروف شہر غازی پور کے ایک بزرگ (شاہ جنیدؒ) کے خاندان سے تعلق رکھنے والے، قدیم کتابوں کے شائق شاہ منیر عالم کے علامہ شبلی اور ان کے تلمیذِ عزیز مولانا سید سلیمان ندویؒ سے روابط کے بارے میں ایک تحریر نظر سے گزری تو ان سے متعلق کچھ مزید جاننے کی طلب ہوئی، پھر ایک ضرورت سے ''حیاتِ شبلی'' کے مقدمہ پر نظر ڈالی تو حسنِ اتفاق سے شاہ منیر صاحب کے بارے میں یہ قیمتی اطلاع ملی کہ انہوں نے علامہ شبلیؒ پر ان کی حیات میں انگریزی میں ایک مضمون لکھا تھا جو الٰہ آباد سے شائع ہونے والے انگریزی رسالہ ''مسلم ریویو'' کی زینت بنا تھا اور اس مضمون کی نسبت یہ بھی معلوم ہوا کہ مضمون نگار نے خود علامہ شبلی سے ان کے احوال معلوم کر کے یہ مضمون تیار کیا تھا اور اس کی اشاعت کے بعد بعض لوگوں نے جب علامہ محترم سے کچھ اپنے ذاتی حالات تحریر کرنے کی فرمائش کی تو انہوں نے کچھ لکھنے کے بجائے ''مسلم ریویو'' میں شائع شدہ اس مضمون کو دیکھنے کا مشورہ دیا۔ جناب شاکر صاحب، ایڈیٹر رسالہ ''ادیب''، الٰہ آباد کے خط کے جواب میں علامہ شبلی تحریر فرماتے ہیں:

> تسلیم!
>
> یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں اپنے حالات خود لکھ سکوں۔ مسلم ریویو میں ایک صاحب نے کچھ واقعات لکھے تھے، وہ آپ لے سکتے ہیں، اس کے سوا سید سلیمان پروفیسر ندوہ کو آپ بتاکید لکھیں تو وہ بہت کچھ لکھ سکتے ہیں۔

شبلی، لکھنؤ

۱۰؍ جولائی ۱۹۱۱ء[1]

علامہ شبلی پر انگریزی مضمون نگار کے بارے میں ''حیاتِ شبلی'' کے مصنف گرامی کی یہ وضاحت ملاحظہ

---

[1] مکاتیبِ شبلی، حصہ اول (مرتبہ: سید سلیمان ندوی) دار المصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء، ص ۳۲۷ (مکتوب نمبر۔ ۳۵)

فرمائیں: ''مسلم ریویو الٰہ آباد کے جس مضمون کا [مکتوبِ شبلی بنام شاکر میرٹھی] میں حوالہ ہے، وہ غازی پور کے مشہور خاندان کے ممتاز فرد شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کا لکھا ہوا ہے جو انگریزی کے اچھے انشاپرداز تھے اور مولانا سے شخصی طور پر واقف تھے۔ یہ مضمون اگست ۱۹۱۲ء کے رسالہ مسلم ریویو الہ آباد میں چھپا تھا۔ اس مضمون کے لئے مختصر حالات خود مولانا نے لکھوادیے تھے، جو تعلیم و سفر و قیامِ علی گڑھ کے چند سرسری واقعات پر مشتمل ہے''[۲]۔

یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ''حیاتِ شبلی'' (ایڈیشن ۲۰۱۵ء) میں صفحہ ۳۵ پر اور آگے ایک اور جگہ (ص ۱۵۴ پر) شاہ منیر عالم کے انگریزی مضمون کا ذکر ''مسلم ریویو'' کے شمارہ اگست ۱۹۱۲ء کے حوالہ سے ملتا ہے، جب کہ اسی کتاب میں صفحہ ۱۴۹ پر حاشیہ نمبر۔۱ کے تحت اس مضمون کے حوالے میں ''مسلم ریویو الٰہ آباد اگست ۱۹۱۰ء'' مندرج ہے[۳]۔ مذکورہ بالا مکتوبِ علامہ شبلی بنام شاکر ایڈیٹر ''ادیب'' کے آخر میں مندرج تاریخ (۱۰/ جولائی ۱۹۱۱ء) دیکھ کر ہی یہ گمانِ غالب ہو گیا تھا کہ شاہ منیر عالم صاحب کا مضمون ''مسلم ریویو'' کے شمارہ ''اگست ۱۹۱۰ء'' میں شائع ہوا تھا (نہ کہ اگست ۱۹۱۲ء کے شمارے میں)، اس لئے کہ ظاہر ہے کہ زیرِ بحث مضمون کی اشاعت کے بعد ہی علامہ شبلی نے اس کے بارے میں جناب شاکر میرٹھی صاحب کو بتایا ہو گا۔ ابھی یہ تحریر تیاری کے مرحلہ میں تھی کہ مسلم ریویو کے متعلقہ شمارے کے بارے میں تقریباً دو تین ہفتہ تک کئی حضرات سے استفسار اور علی گڑھ، اعظم گڑھ، الہ آباد، لکھنؤ کی معروف لائبریریوں میں تلاش و جستجو کے بعد شکرِ الٰہی کہ اُس لائبریری میں مطلوبہ شمارہ کا سراغ ملا جو حسنِ اتفاق کہ ندوۃ العلماء (لکھنؤ) میں علامہ ہی کے نامِ نامی سے منسوب (کتب خانہ علامہ شبلی نعمانیؒ) ہے۔ اس کتب خانہ کے قیمتی ذخائر کا میں پہلے سے معترف و قدرداں تھا، مسلم ریویو کے مطلوبہ شمارہ کی اس میں دستیابی کی اطلاع پر اس کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی۔ اس طالبِ علم کو لکھنؤ یونیورسٹی میں طالب علمی کے دوران سے ہی قدیم و جدید قیمتی و مفید کتابوں کے اس مخزن سے استفادہ کا شرف حاصل رہا ہے۔ مسلم ریویو کی فائل کی تلاش و جستجو میں خصوصی دلچسپی اور اس سلسلہ میں مطلوبہ تعاون کے لیے میں انتہائی ممنون ہوں ناظرِ کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی برادرِ مکرم مولانا فیضان احمد نگرامی صاحب کا، اور ان کی مزید کرم فرمائی کا کہ اس عاجز طلب گار کو مضمون کی کاپی بھی فراہم کردی۔ جزاہم اللہ تعالیٰ احسن الجزاء۔ اس خاکسار کے ساتھ موصوف کے مخلصانہ تعاون پر ''کتب خانہ حبیب گنج'' کے بارے میں بعض اہلِ علم کے مشاہدات و تاثرات کو پڑھ کر ایک مضمون میں اپنا لکھا

---

[۲] حیاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء، ص ۳۵

[۳] حیاتِ شبلی، محولہ بالا، ص ۱۴۹، ۱۵۴، ۳۵، حاشیہ نمبر۔۱

ہوا یہ جملہ یاد آگیا کہ جویائے علم یا شائقینِ کتب کے ساتھ کتب خانہ کے ذمہ دار یا منتظم کے کریمانہ برتاؤ اور فراخدلانہ تعاون پر مطالعہ و تحقیق کا شوق اور بڑھ جاتا ہے۔ بہر حال اس مضمون اور متعلقہ شمارے کے پہلے صفحہ کو دیکھ کر یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ علامہ شبلی پر شاہ صاحب کا مضمون مسلم ریویو کے شمارہ ''اگست ۱۹۱۰ء''میں شائع ہوا تھا۔ (کتابوں میں کتابت، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، طباعت کی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، یہ کوئی انہونی بات نہیں ہے۔ امید کہ ''حیاتِ شبلی'' کے آئندہ ایڈیشن کی تیاری کے وقت دونوں مقام پر مسلم ریویو میں شاہ منیر عالم مرحوم کے مضمون کے سنِ اشاعت کی تصحیح کر دی جائے گی)۔ یہاں یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ یہ ماہانہ رسالہ ''The Muslim Review'' جو الٰہ آباد سے شائع ہوتا تھا،اس کے ایڈیٹر ایم۔ ابوالفضل تھے۔ گوگل میں سرچ کرنے پر یہ مزید معلوم ہوا کہ اس انگریزی رسالہ کے ناشر ایم۔ رمضان علی تھے اور یہ سٹی پریس، الہ آباد سے طبع ہوتا تھا۔

شاہ منیر عالم صاحب کا یہ انگریزی مضمون نو صفحات (۱۴۶۔۱۵۴) پر مشتمل ہے اور اس کا عنوان اور مضمون نگار کا نام اس طور پر مندرج ہے:

"Shamsul Ulama Maulana Shibli Nomani and His Works - An Appreciation"
by Shah Muneer Alam, B.A. L.L.B

مسلم ریویو کے زیرِ نظر شمارے پر جلد۔ ۱۱، شمارہ۔ ۲، اگست ۱۹۱۰ء لکھا ہوا ہے [۴]۔ رسالہ کے شمارہ نمبرات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہر ۶ ماہ پر ایک جلد مکمل ہوتی تھی۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ''مسلم ریویو'' کا اجراء غالباً جولائی ۱۹۰۵ء میں عمل میں آیا تھا۔

یہ مضمون مختلف اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں علامہ شبلی کے ذاتی احوال و کوائف کے علاوہ ان کی تعلیمی زندگی، عملی زندگی کی مصروفیات (بالخصوص ایّامِ علی گڑھ کی سرگرمیوں) اور علمی خدمات کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے مشتملات کی قدر و قیمت خاص طور سے اس وجہ سے ہے کہ براہِ راست علامہ شبلی سے ان کے احوال و کوائف معلوم کر کے یہ مضمون تیار کیا گیا تھا۔ دوسرے: اس کی اشاعت کے بعد جب بعض لوگوں نے علامہ شبلی سے ان کے حالات و علمی کاموں کے بارے میں استفسار کیا تو جواب میں کچھ بتانے یا لکھنے کے بجائے انہوں نے اسی انگریزی مضمون کو دیکھنے کا مشورہ دیا تھا، جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے۔ تیسرے ان کی حیات میں ان پر کسی انگریزی رسالہ میں شائع ہونے والا غالباً اولین دستیاب مضمون ہے۔ مزید براں اس مضمون کی قدر و قیمت اس پہلو سے بھی واضح ہوتی ہے کہ ''حیاتِ شبلی'' کے مصنفِ

---

[۴] *The Muslim Review* (Allahabad), vol.11, No.2, August 1910, Contents & p.146

محترم نے اپنے استاد گرامی کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے دو مقام پر اس مضمون کا حوالہ دیا ہے۔ علامہ شبلی کے تعلیمی مراحل کی تکمیل کے تذکرہ میں سید صاحب نے یہ تحریر فرمایا ہے کہ جب وہ سہارن پور میں ممتاز محدث مولانا احمد علی سہارن پوری کے درسِ ترمذی سے مستفیض ہو رہے تھے ، استادِ مکرم کی اجازت سے اپنے والدِ محترم اور بعض خاندانی اعزّہ کے ساتھ مبارک سفر پر روانہ ہو گئے۔ اسی ضمن میں انھوں نے یہ مزید واضح کیا کہ : ''اس وقت مولانا کی عمر انیس برس تھی اور کل مدتِ تحصیل چودہ برس ہے''۔ اس پر حاشیہ میں حوالے کے طور پر یہ درج ہے: ''تذکرہ علمائے حال مولوی ادریس صاحب نگرامی، مطبوعہ نول کشور وانگریزی مضمون شاہ منیر عالم صاحب غازی پور شائع شدہ مسلم ریویو الٰہ آ، باد، اگست ۱۹۱۰ء، ص ۱۵۲''[۵]۔ (یہاں یہ بھی واضح رہے کہ ''حیاتِ شبلی'' کے ۲۰۱۵ء کے ایڈیشن میں کتابت یا طباعت کی غلطی سے مسلم ریویو کے حوالے میں ''ص ۵۲'' مندرج ہے، جب کہ اصل مضمون میں متعلقہ معلومات صفحہ ''۱۵۲'' پر دی گئی ہیں اور ''حیاتِ شبلی'' کے اولین ایڈیشن میں بھی ''ص ۱۵۲'' ہی ملتا ہے)۔ اسی طرح تعلیم کی تکمیل کے بعد دیگر مصروفیات کے ساتھ استاد گرامی کے درس و تدریس سے بھی شغف رکھنے کی بابت اِسی مضمون کے حوالے سے سید صاحب رقم طراز ہیں: شاہ منیر عالم صاحب غازی پوری مرحوم نے اگست ۱۹۱۲ء کے مسلم ریویو الہ آباد میں مولانا شبلی کے حالات پر انگریزی میں جو مضمون لکھا ہے اور جس کے واقعات خود مولانا کے بتائے ہوئے ہیں، اس میں لکھا ہے: ''تکمیل سے فراغت کے بعد انھوں نے دو برس درس و تدریس اور مناظرہ و تلقین میں بسر کیے''[۶]۔

علامہ شبلی پر خود ان کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی شاہ منیر عالم مرحوم کے اس یادگار انگریزی مضمون کا اردو ترجمہ افادیت سے خالی نہ ہوگا۔

اللہ کرے اس کی توفیق نصیب ہو۔

اس ضمن میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ مطالعاتِ شبلی کے ماہر اور ممتاز مصنف ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی کے بیان کے مطابق علامہ شبلی پر ایک اور انگریزی مضمون ان کی حیات میں کلکتہ کے اخبار Daily Morning News میں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا جو مشہور ادیب اور اردو و فارسی کے نامور شاعر سید رضا علی وحشت (م ۲۰، جولائی ۱۹۵۶ء) کا تحریر کردہ تھا۔ یہ مضمون انھوں نے علامہ شبلی کے حالات اور ان کی علمی خدمات پر اس وقت لکھا تھا جب وہ مسلم انسٹی ٹیوٹ کی دعوت پر کلکتہ تشریف

---

[۵] حیاتِ شبلی، ص ۱۴۹، حاشیہ نمبر۔ ۱

[۶] حیات شبلی، محولہ بالا، ص ۱۵۴

لے گئے تھے اور وہاں ان کے اعزاز میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا اور اس موقع پر انہوں نے علامہ شبلی کے استقبال میں چند فارسی اشعار بھی پیش کئے تھے۔ اس مضمون سے متعلق ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی صاحب نے یہ بھی تحریر کیا ہے: ''یہ علامہ شبلی پر انگریزی میں غالباً پہلا مقالہ تھا''[7]۔ سید رضا علی وحشت کا یہ مضمون دستیاب نہیں ہوسکا اور نہ ہی یہ معلوم ہوسکا کہ یہ مذکورہ اخبار کے کس تاریخ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ فاضل مصنف سے استفسار پر یہ معلوم ہوا کہ یہ مضمون ان کی نظر سے بھی نہیں گزرا ہے۔ ان وجوہ سے ڈیلی مارننگ نیوز کے متعلقہ شمارے کی تاریخ اور اس میں شائع شدہ مضمون کی نوعیت کے بارے میں ابھی قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ بہر حال علامہ شبلی پر اس دوسرے انگریزی مضمون کی اشاعت کی اطلاع سے یہ مزید ثبوت ملتا ہے کہ علامہ شبلی کی حیات ہی میں ان کے حالات و علمی کارناموں پر مختلف زبانوں میں مضامین کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوچکا تھا جو بلاشبہ علمی حلقوں میں ان کی قدر دانی اور مقبولیت کی ایک واضح شہادت ہے۔

''حیاتِ شبلی'' اور بعض دوسرے مآخذ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاہ منیر عالم کے خانوادہ سے علامہ شبلی کے روابط بہت پہلے سے رہے ہیں، یہ دراصل ان کی ایّامِ طالب علمی کی یادگاروں میں شامل ہیں۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ علامہ شبلی نے متعدد علماء سے استفادہ کے بعد اپنے والدِ محترم کی ہدایت پر غازی پور میں مولانا محمد فاروق چریّاکوٹی سے کسبِ فیض کیا جو اُن دنوں وہاں کے مشہور و قدیم مدرسہ چشمۂ رحمت میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہاں تعلیم کے دوران علامہ شبلی شاہ منیر عالم کے آباء واجداد کے قدیم مکان کے ایک کمرے میں اقامت پذیر رہے ہیں، جیسا کہ حیاتِ شبلی کے مصنفِ گرامی کے اس بیان سے واضح ہوتا ہے: ''غازی پور میں گنگا کے کنارے قدیم شرفاء کا ایک محلہ جس کو میاں پورہ کہتے ہیں۔ یہاں شاہ جنید صاحب ایک بزرگ کا خاندان آباد ہے جو شاہ صاحبوں کا خاندان کہلاتا ہے، شاہ منیر عالم وغیرہ اسی خاندان کے مشہور افراد ہیں۔ مورث اول شاہ جنید کی بنوائی ہوئی مسجد کا لبِ دریا نہایت دلکش منظر ہے۔ اسی کے قریب اس خاندان کا مکان ہے، مولانا شبلی مرحوم غازی پور میں اسی مکان کی ایک کوٹھری میں رہتے تھے، خاکسار جب غازی پور گیا تھا تو یہ کوٹھری اسے دکھائی گئی تھی''[8]۔

یہاں یہ ذکر بر محل معلوم ہوتا ہے کہ مہتمم مدرسہ دینیہ غازی پور، ممتاز عالمِ دین و مصنفِ شہیر اور میرے دیرینہ کرم فرما مولانا عزیز الحسن صدیقی صاحب نے اپنی وقیع تصنیف ''تذکرہ مشاہیرِ غازی پور''

---

[7] محمد الیاس الاعظمی، شبلی سخنوروں کی نظر میں، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء، ص ۱۰۵-۱۰۶۔ نیز دیکھئے: محمد الیاس الاعظمی، کتابیاتِ شبلی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، ۲۰۱۱ء، ص ۲۲۹

[8] حیاتِ شبلی، محولہ بالا، ص ۱۳۴-۱۳۵

میں شاہ منیر عالم کے مورثِ اول شاہ جنید کے حالات تفصیل سے رقم فرمائے ہیں۔ان سے یہ معلوم ہوتا ہے شاہ جنیدؒ کے اجداد میں حامد شاہ مع اہل و عیال سلطان فیروز شاہ تغلق کے عہد (۱۳۵۱۔۱۳۸۸ء) میں واردِ ہند ہوکر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے تھے اور پھر انہی کا خاندان دہلی سے سارن (بہار) منتقل ہوا اور اسی ضلع کے موضع حسن پور میں شاہ جنید کی ولادت ہوئی اور یہیں ان کی تعلیم و تربیت کے مراحل طے ہوئے۔اس کے بعد وہ ایک طویل عرصہ تک ارض مقدس میں مقیم رہے، اسی دوران بغداد جاکر شاہ درویش قادری سے بیعت کی۔ ۹۷۹ھ / ۱۵۷۱ء میں وہ اہل و عیال کے ساتھ غازی پور منتقل ہوئے اور یہاں سکونت اختیار کی، اور تقریباً ۲۰ برس بعد اسی شہر میں ۹۹۹ھ / ۱۵۹۰ء میں ان کی وفات ہوئی اور سٹی اسٹیشن کے قریب مدفون ہوئے۔ اسی کتاب میں یہ بھی مذکور ہے کہ ''بود شبلی جنید ثانی وائے'' سے ان کی تاریخِ وفات اخذ کی گئی[۹]۔

حیاتِ شبلی میں مصنفِ محترم کے بعض بیانات اور معارف کے اداریوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شاہ منیر عالم صاحب کے خانوادہ سے ان کے روابط بھی بدستور برقرار رہے، شاہ صاحب کی ان سے مراسلت رہی اور وہ خود کبھی کبھار غازی پور ان کے گھر جایا کرتے تھے، جیسا کہ اوپر مذکور ان کے بیان سے ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے، ان دونوں میں تعلقات کی مضبوطی کا ایک سبب ان کا ایک وصف مشترک (قدیم قیمتی کتب و مخطوطات کا پتہ لگانے، انہیں دیکھنے، حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کا ذوق و شوق) بھی بنا۔ یہ بخوبی معروف ہے کہ سید صاحب قدیم ذخائرِ کتب میں بڑی دلچسپی رکھتے تھے، مخطوطات اور قدیم و نایاب قیمتی مطبوعات کے قدرداں تھے، ان کے بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع ملنے یا انہیں دیکھنے کا موقع ملنے پر بہت خوش ہوتے تھے، جیسا کہ ان کے شذراتِ معارف و خطوط سے اس کی واضح شہادت ملتی ہے۔ سید صاحب کے مرتبہ معارف کے اداریوں (شذرات) میں شاید ہی کوئی اداریہ ہو جس میں کسی کتاب، صاحبِ کتاب یا کسی کتبخانہ کا ذکر نہ ہو۔ شاہ منیر عالم صاحب بھی قدیم کتب اور مخطوطات کے شائق تھے، قدیم ذخائر سے دستیاب کتابیں خرید کر اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب میں اضافہ کرتے رہتے تھے۔ سید صاحب کو جب شاہ صاحب کے یہاں ''دیوان حافظ'' کے ایک نہایت قیمتی و نادر نسخہ کی دستیابی کی اطلاع ملی تو جولائی ۱۹۲۲ء کے معارف کے شذرات میں اس کا تذکرہ بڑے اہتمام سے ان الفاظ میں فرمایا:

> جناب شاہ منیر عالم صاحب منصف اور رئیس غازی پور شہر مذکور کے ایک ممتاز خاندان سے ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ ان کے پاس دیوانِ حافظ کا ایک عجیب و غریب نسخہ ہے۔ یہ نسخہ

---

[۹] عزیزالحسن صدیقی، تذکرہ مشاہیرِ غازی پور، مکتبۂ حسن، غازی پور، طبع سوم۔ ۲۰۲۱ء، ص ۱۷۴۔۱۷۶

دربارِ اکبری کے شاعر فیضی کے دستِ خاص کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے، اس کے دیباچہ میں مذکور ہے کہ ملّا آقا ایک بزرگ بادشاہ کی طرف سے متعین کئے گئے تھے کہ وہ دیوان حافظ کا ایک صحیح نسخہ مرتب کریں۔ ملّا صاحب نے خود حافظ کے وطن شیراز جا کر دس برس قیام کیا اور وہاں سے ایک صحیح نسخہ مرتب کر کے بادشاہ کے لیے ہندوستان لائے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''جن جن اصحاب نے اس نسخہ کو دیکھا ہے، سب کی یہی رائے ہے کہ اس سے زیادہ صحیح نسخہ دوسرا نہ ہوگا''۔ اگر یہ سچ ہے تو حافظ کے اشعار کے ملحقات اور بعض اشعار کے مختلف نسخوں کے انتخاب میں اس سے بہترین مدد مل سکتی ہے[۱۰]۔

اسی طرح جب شاہ منیر عالم صاحب نے فارسی دواوین کا ایک قیمتی ذخیرہ الٰہ آباد کے ایک صاحب سے خرید کر حاصل کیا اور سید صاحب کو اسے دیکھنے کا موقع ملا تو اس پر معارف جولائی ۱۹۳۲ء کے شذرات میں نہ صرف مسرت ظاہر کی، بلکہ شاہ صاحب کے قیمتی کتابیں جمع کرنے اور ان کے تحفظ کے شوق پر داد تحسین پیش کرتے ہوئے اہم دواوین کے نام بھی مندرج کئے۔ متعلقہ شذرات کا یہ حصہ خود ان کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں:

غازی پور میں حضرت شاہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کا خاندان ایک مدت سے آباد ہے، اللہ تعالیٰ نے شرافت، حسب و نسب کے ساتھ علم و دولت کو بھی اس خاندان میں جمع کر دیا ہے۔ اس خاندان کے ایک مشہور ممبر شاہ منیر عالم صاحب ہیں جن کو بزرگوں کے اندوختہ کی حفاظت کا بڑا شوق ہے۔ لوگوں کو یاد ہوگا کہ الٰہ آباد میں بزرگوں کی یادگار منشی غلام غوث صاحب بے خبر، میر منشی لفٹیننٹ گورنر صوبۂ متحدہ ایک بزرگ تھے، جن کے نام غالب مرحوم کے خطوط چھپے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس فارسی دواوین کا بڑا ذخیرہ تھا، یہ ذخیرہ جناب شاہ منیر عالم صاحب نے خرید لیا تھا اور اس وقت ان کے پاس ہے۔ مجھے بھی شاہ صاحب کی عنایت سے اس ذخیرہ کی کچھ کتابیں دیکھنے کی مسرت حاصل ہوئی، جن میں حسبِ ذیل چیزیں قابلِ ذکر معلوم ہوئیں: دیوان ملّا سعید اشرف مازندرانی استاد زیب النساء بیگم، رسائلِ نعمت خان عالی، دیوانِ نوعی، رقعاتِ حزیں، دیوانِ کمال، دیوان کاملِ عرفی، کلیاتِ خواجہ میر اثر دہلوی مع مثنوی خواب و خیال دیوانِ محتشم کاشی، دیوانِ ظہیر فاریابی، دیوانِ صائب، دیوانِ فاخر مکین، مثنوی فارسی شہزادہ بلند اختر در مرگ معشوقۂ خویش۔ سب سے بہتر حافظ کا ایک دیوان ہے جس کو ملّا مقصود ولد آقا ملّا ایرانی نے اکبر کے عہد میں ایران میں دس برس کی مدت میں قدیم نسخوں سے مقابلہ کر کے صحیح کیا ہے،

---

[۱۰] شذرات، معارف، ۱۰؍۱، جولائی ۱۹۲۲ء، ص ۳۔۴؛ شذراتِ سلیمانی، دار المصنفین شبلی اکیڈمی۔ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء، ۱؍ ۲۱۲۔۲۱۳

اس میں حافظ کے نام کی یہ غزل موجود نہیں:

ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم

اس سے اس غزل کے الحاقی ہونے کا گمان ہوتا ہے"[11]۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جس اہتمام سے شاہ منیر عالم صاحب کے ذاتی ذخیرۂ کتب کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے کچھ نوادرات کی قدر و قیمت واضح کی ہے، اس سے نہ صرف قدیم کتب سے سید صاحب کی گہری دلچسپی ظاہر ہوتی ہے، بلکہ صاحبِ ذخیرہ سے ان کے قریبی روابط کا بھی ثبوت ملتا ہے۔

مزید یہ کہ شاہ منیر عالم صاحب کے بارے میں معارف کے مذکورہ بالا شذرات میں سید صاحب نے ان کے ذکر میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ وہ "منصف و رئیس ہیں"۔ زیر بحث مضمون میں ان کے نامِ نامی کے ساتھ B.A. L.L.B لکھا ہوا ہے۔ اس سے ان کی تعلیمی لیاقت کے بارے میں معلوم ہوتا ہے۔ انہی کے خاندان کے ایک ممتاز فرد شاہ غیاث عالم بھی تھے۔ ان کے بارے میں "تذکرہ مشاہیرِ غازی پور" کے مصنفِ محترم نے یہ ذکر کیا ہے کہ وہ جج کے منصب پر فائز تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور اسی شہر میں ۲۶، اپریل ۱۹۸۳ء کو ان کی وفات ہوئی۔ افسوس کہ تلاش بسیار کے باوجود شاہ منیر عالم کی تاریخ وفات نہیں معلوم ہو سکی۔

مختصر یہ کہ ایک بزرگ خانوادہ سے تعلق رکھنے والے و علم دوست اور علامہ شبلی کے معتقد و قدر داں شاہ منیر عالم صاحب مرحوم کے حالات، ان کی علمی زندگی اور اکابرِ دارالمصنفین سے ان کے روابط پر فی الحال یہی معلومات دستیاب ہو سکی ہیں، اس سمت میں ابھی تلاش و جستجو جاری ہے۔ ان سے متعلق مزید معلومات کی فراہمی کے لیے یہ عاجز راقم "معارف" کے قارئینِ کرام کا ممنون ہوگا۔ ربِّ زِدْنِیْ عِلْماً۔ آمین ثم آمین۔

---

[11] سید سلیمان ندوی، شذرات، معارف، ۳۰، ۱، جولائی ۱۹۳۲ء، ص ۴؛ شذراتِ سلیمانی، دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء، ۲، ۳۴۸۔۳۴۹

جموں و کشمیر کی خواتین ناول نگار

محمد یاسین گنائی، کشمیر

myganie123@gmail.com

اردو میں ناول نگاری کی عمر کوئی زیادہ نہیں۔ ۱۸۶۹ء میں ڈپٹی نذیر احمد نے اردو کا پہلا ناول ''مرآۃ العروس'' کے نام سے لکھا تھا، جبکہ خواتین کے قلم سے لکھا گیا پہلا ناول ۱۸۸۱ء میں رشیدۃ النساء بیگم کا لکھا ''اصلاح النساء'' ہے۔ علاقائی ادب کے تحت بہار، بنگال، دہلی، دکن، لاہور وغیرہ میں ناول نگاری کے حوالے سے بہترین تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکا ہے۔ جموں و کشمیر میں ناول نگاری کے بارے میں تین چار تحقیقی مقالات اور ایک درجن کے قریب تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے جا چکے ہیں اور کسی حد تک پہلے ناول نگار کا تعین بھی ہو چکا ہے۔ فکشن ناقدین نے محمد الدین فوقؔ، سالک رام سالک، موہن لال مروہ اور شمبھو ناتھ کول کو پہلا ناول نگار ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن محمد الدین فوقؔ کے ناول ''انارکلی'' (۱۹۰۰ء) کے بارے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے کہ وہی ریاست کا پہلا مکمل ناول ہے۔ حالانکہ سالکؔ کا ''تحفہ سالک''، مروہؔ کا ''داستانِ محبت'' اور شمبھو ناتھ کا ''بیوہ کی فریاد'' بھی اسی دور کے یادگار ناول ہیں۔ بد قسمتی کی بات ہے کہ ابھی تک جموں و کشمیر کی پہلی خاتون ناول نگار اور دیگر اہم خواتین ناول نگاروں پر کوئی مفصل مضمون نہیں لکھا گیا ہے۔ اس مضمون کا مقصد ریاست کی گمنام خواتین ناول نگاروں کی کوششوں کا جائزہ لینا ہے۔

جموں و کشمیر میں اردو نہ کسی کی مذہبی زبان ہے اور نہ یہ کسی گروہ کی مادری زبان ہے بلکہ یہ ریاست کے تینوں خطوں (کشمیر، جموں اور لداخ) میں بطور رابطے کی زبان استعمال ہوتی ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ ریاست کے مختلف علاقوں میں انگریزی ، فارسی، ہندی، کشمیری، ڈوگری، لداخی، پہاڑی، شینا، گوجری اور پنجابی زبانیں بھی بولی جاتی ہیں۔ جموں و کشمیر میں رائج ان زبانوں میں ریاستی خواتین نے بہترین ناول لکھے ہیں۔ جیسے نتاشا کول نے انگریزی زبان میں Residue (۲۰۰۹) اور Future Tense (۲۰۲۰ء) لکھے ہیں ۔ فرح بشیر نے (۲۰۲۱ء) Rumours of Spring: A Girlhood in Kashmir لکھا ہے۔ چندر کانتا نے ہندی زبان میں سات ناول ''سلاخوں کے پیچھے''، ''پوش نول کی واپسی''، ''سورج اُگنے تک''، ''ابّو نے کہا تھا''، ''اعلان گلی جاری ہے''، ''کالی برف''، ''یہاں وتستا بہتی ہے'' لکھے ہیں۔ ڈوگری زبان میں پدما سچ دیو نے ناول ''اک ہی سگی'' لکھا ہے۔ سجان کور بالی نے ۲۰۱۸ء میں ایک پنجابی تاریخی ناول کا اردو ترجمہ ''لہو کے اٹوٹ رشتے'' کے نام سے کیا ہے۔ ان تمام ناولوں سے یہ پہلو واضح ہو جاتا ہے کہ جموں و کشمیر کی خواتین نے مختلف

زبانوں میں ناول لکھ کر اپنا لوہا منوایا ہے۔ جہاں تک اردو زبان میں ریاستی خواتین کے لکھے ناولوں کی بات ہے تو یہ ناول انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان خواتین ناول نگاروں میں رضیہ بٹ، فرحت آرا حیدری، بیگم محمودہ بشیر، زینت فردوس زینت، ترنم ریاض، نعیمہ مہجور، رخسانہ تبسم اور رافعیہ رسول مغموم شامل ہیں۔

(۱) رضیہ بٹ (۱۹۲۴-۲۰۱۲)

رضیہ بٹ کشمیری نژاد ناول نگار ہیں جن کے آباواجداد نے ڈوگرہ دور میں گلمرگ کشمیر سے قحط سالی کے سبب ہجرت کی تھی۔ وہ خود کبھی کشمیر نہیں آئیں البتہ تقسیم ہند کے بعد ایک دفعہ سیر و تفریح کے سلسلے میں مظفر آباد تک آئی تھیں۔ ان کے والد اکثر کشمیر آتے رہتے تھے اور یہاں سے زعفران، سیب، اخروٹ، بادام وغیرہ لے جاتے تھے۔ علامہ اقبال اور رضیہ بٹ کے خاندان نہ صرف آپس میں رشتہ دار تھے بلکہ دونوں ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہوئے تھے۔ اپنے خاندان کا قحط کے سبب ہجرت کرنے کے بارے میں لکھتی ہیں:

> میرا تعلق ایک ممتاز کشمیری گھرانے سے ہے۔ ہمارے آباواجداد کشمیر کے ایک خوبصورت اور جنتِ نظیر گاوں گلمرگ کے رہنے والے تھے۔۔۔ بچپن میں مجھے یاد ہے ابا جی کشمیر گئے تھے اور وہاں سے سیبوں کی پیٹی لائے تھے۔ ان سیبوں کی خوشبو اور مہک سارے گھر میں پھیل گئی تھی۔ اور وہ خوشبو میرے اندر اب بھی مقید ہے۔[۱]

انہوں نے ۱۹۴۰ء میں پہلا ناول ''نائلہ'' لکھنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کا پہلا شائع شدہ ناول ''ناہید'' (۱۹۵۹ء) ہے۔ ان کے بیشتر ناولوں میں عورتوں کے مسائل کی عکاسی ملتی ہیں اور زیادہ تر ناولوں میں مرکزی کردار کوئی خاتون ہے۔ ان کی کہانیوں میں حقیقت نگاری کی تلخ و تند سچائیوں کا عنصر ایک مثبت انداز میں ملتا ہے۔ وہ زندگی کے چلتے پھرتے کردار اور عام فہم الفاظ سے اپنی کہانیوں کا تانا بانا بنتی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کی طرح وہ اپنے ناولوں کا آغاز کسی نہ کسی شعر یا نظم سے کرتی ہیں۔ اگرچہ رضیہ بٹ کے کشمیری نژاد ہونے میں کوئی شک نہیں ہے لیکن ان کا خاندان پچھلے دو سو سال سے موجودہ پاکستان میں قیام پذیر رہے۔ ان کی ولادت اور وفات موجودہ پاکستان میں ہی ہوئی ہے لیکن کشمیر سے ان کی نسبت مسلّم ہے۔ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ کرشن چندر، کشمیری لال ذاکر اور عزیز احمد وغیرہ کی طرح رضیہ کے ناولوں میں ''کشمیر کی عکاسی'' پر تحقیقی کام کیا جائے۔ کشمیر کی مٹی کی ادبی زرخیزی سے انکار ممکن نہیں ہے۔

۱۔ رضیہ بٹ، بچھڑے لمحے، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۴، ص: ۷

(۲)فرحت آراحیدری(۱۹۴۱ـ۲۰۱۲)

نواب آرا بیگم اپنے قلمی نام ''فرحت آراحیدری'' سے زیادہ مشہور ہوئی ہیں۔ان کی شادی کشمیر کے نامور محقق پروفیسر اکبر حیدری کاشمیری سے ۱۹۶۲ء میں ہوئی تھی۔ فرحت آرا نے بچپن اور جوانی کے اکیس سال لکھنو میں اور شباب ولاشباب کے پچاس سال کشمیر میں گزارے۔ان کی تحریروں میں لکھنوی اردو کی نفاست، سلاست، فصاحت وبلاغت جیسی خوبیوں کی وجہ ان کا قیام لکھنؤ ہے نیز کشمیر کی خوبصورتی ورعنائی نے ان کی تحریروں کو حسن وخوبی میں اضافہ ہی کیا ہے۔ان کے ناول میں کشمیریت اور لکھنویت کا حسین سنگم ہیں۔ان کے ناولوں میں اپنا اپنا نصیب، فطرت، دلکش نغمہ، عرفان، کوثر وتسنیم، چاند کے پار چلو، سچا موتی اور شیرین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ان کا پہلا ناول ''اپنا اپنا نصیب'' ۱۹۷۰ء کے آس پاس شائع ہوا تھا۔اگرچہ یہ ناول اب دستیاب نہیں ہے لیکن ان کے چوتھے ناول ''چاند کے پار چلو'' (۱۹۷۴ء) میں لکھا گیا کہ :

> مصنفہ کا پہلا ہی ناول ''اپنا اپنا نصیب'' کافی پسند کیا گیا تھا۔اس کے بعد دو ناول ''عرفان کوثر وتسنیم''، ہم نے شائع کئے۔ قارئین نے بہت پسند کئے۔ان کی مطبوعات کا یہ عالم ہے کہ ناول بازار میں آتے ہی فروخت ہو جاتا ہے۔[۲]

ان کے ناول '' فطرت'' پر اثر لکھنوی، پنڈت آنند نرائن ملا، ڈاکٹر وحید ضیا عظیم آبادی، شیخ محمد عبداللہ وغیرہ نے خوبصورت تبصرے لکھے۔ جبکہ عشقیہ ناول ''کوثر وتسنیم'' (۱۹۷۳ء) پر ناول ''امراؤ جان ادا'' کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔اس میں جگہ جگہ شاعری کی جلوہ گری ہے اور مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ بھی ہے۔ زبان، اسلوب، کردار نگاری، منظر نگاری، جزئیات نگاری اور علاقائی اثر کے اعتبار سے یہ ایک بہترین ناول ہے۔ کوثر اور تسنیم کی محبت میں لیلی مجنون، شیرین فرہاد اور ہیر رانجھا جیسی کشش پیدا کی گئی ہے۔

فرحت آرا کا ناول ''چاند کے پار چلو'' (۱۹۷۴ء) میں دو خاندانوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ اس کا خاص موضوع ذات پات کے سبب شادی بیاہ میں رکاوٹیں ہے۔ اس کے اہم کردار صبا، شمیم، کلیم الدین، علیم الدین، بملا وغیرہ ہیں۔اس میں فرحت نے قدیم داستانوں اور ناولوں کی طرح جگہ جگہ پند ونصائح کا دربار سجایا ہے اور قرآنی آیات واحادیث سے ذات پات کے مسائل پر لڑنا جھگڑنا گناہ قرار دیا ہے۔ ذات پات کے مسئلہ پر بملا کی نصیحت آمیز باتوں سے قدیم داستانوں اور مثنویوں میں تقریر کرنے والے

۲۔ فرحت آرا حیدری، چاند کے پار چلو، مکتبہ ادبستان نرسنگ گڈھ سرینگر، کشمیری، اشاعت دوم، مارچ ۱۹۷۴، ص: ۴

طوطے اور مثنوی زہر عشق کی ہیروئن یاد آتی ہے۔ بملا قرآنِ مجید کا حوالہ دیتے ہوئے صبا کی ماں سے یوں مخاطب ہوتی ہے:

> اس زمانے میں قوم ذات کا مسئلہ کھڑا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔آپ انکل کو سمجھانے کی کوشش کیجئے۔ بات بڑھانے سے فائدہ نہیں، صرف رسوائی ہوگی۔ اگر آپ اپنی لڑکی کی بہتری چاہتی ہیں تو یہ رشتہ منظور کرلیجئے۔ایک ماں کا دل ممتا کے جذبے سے لبریز ہوتا ہے، باپ کا نہیں۔آپ کو اپنی لاڈلی بیٹی کی طرفداری کرنا چاہیے، ورنہ ہمیشہ کے لئے اس کے دل کا سکون چھن جائے گا۔قرآن پاک میں بھی تو یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکی کی مرضی کے خلاف شادی نہ کرو۔ اگر آپ نے کہیں زبردستی شادی کی تو وہ جائز کہاں ہوگی؟۔ [۳]

ان کا آخری ناول ''شیریں'' ایک رومانی و معاشرتی ناول ہے۔اس ناول کے بارے میں ان کے فرزند ڈاکٹر ظفر حیدری لکھتے ہیں:

> اس کا پلاٹ انوکھا اور دل آویز ہے۔ان کے اندازِ بیان میں ظرافت کی چاشنی بھی ہے، شوخی اور رنگینی کے ساتھ رعنائی بھی ہے۔اس میں ادبی شان بھی ہے اور دلچسپ مکالمے بھی ہیں۔پوری کہانی مکمل ہے اور کہانی میں کہیں پر بھی جھول نہیں ہے۔ شروع سے آخر تک قصے میں ربط وتسلسل ہے۔ [۴]

فرحت آرا تاریخی اعتبار سے جموں وکشمیر کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں اگرچہ ان کی پیدائش لکھنو میں ہوئی ہے لیکن انہوں نے شادی کے آٹھ سال بعد پہلا ناول لکھ کر دبستان کشمیر کی خواتین کی اس صنف ادب کی جانب توجہ مبذول کرائی۔ کشمیری ادب میں درجنوں مثالیں ایسی ملتی ہیں جہاں محض کشمیر میں نوکری کرنے کے سبب بیرون ریاست کے باشندوں کو کشمیری قلمکاروں میں شامل کیا گیا ہے، تو شادی جیسے عظیم رشتے کے باوجود کیوں فرحت آرا کو کشمیری کہنا غلط ہے؟ ہمارے نزدیک ریاست کی پہلی خاتون ناول نگار ہیں۔

(۳) بیگم محمودہ بشیر

بیگم محمودہ بشیر کا شمار جموں وکشمیر کی نمائندہ خواتین ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے والد ملک شیر محمد جموں وکشمیر میں بطور مالیات سکریٹری خدمات انجام دے چکے ہیں۔قرین قیاس ہے کہ ان کی صاحبزادی بیگم محمودہ بشیر کی ولادت بھی کشمیر میں ہی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ محمودہ نے ابتدائی تعلیم کشمیر میں ہی حاصل

۳۔ فرحت آرا حیدری، چاند کے پار چلو، مکتبہ ادبستان نرسنگ گڈھ سرینگر، کشمیری، اشاعت دوم، مارچ ۱۹۷۴، ص: ۲۲۳

۴۔ مجلہ، بازیافت، شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی، شمارہ: ۳۶-۳۷، ۰۶-۲۰۰۵، ص: ۲۳۸-۲۳۹

کی تھی۔حبیب کیفوی نے ''کشمیر میں اردو'' میں محمودہ بیگم کے ذکر میں ان کی پیدائش کا ذکر نہیں کیا ہے۔جب ۱۹۴۷ء کا کربناک حادثہ پیش آیا تو متعدد مسلم گھرانے ہندوستان اور کشمیر چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ان میں بیگم محمودہ بشیر کا خاندان بھی ہجرت کرکے لاہور میں سکونت پذیر ہوگیا۔اس بات کے قوی شواہد ملتے ہیں کہ ان کے دل میں کشمیر اور کشمیریوں کا اتنا درد تھا کہ جو بھی مہاجر کشمیر سے لاہور پہنچتا ،تو محمودہ اپنوں کی طرح ان کی آو بھگت وخدمت کرتی تھی۔علامہ اقبال کی طرح ان کی ہر سانس میں کشمیر کی یادیں بسی ہیں۔حبیب کیفوی نے لکھاہے:

جس وادی گلریز میں زندگی کا بہترین حصّہ گذارا اس کے حصول کے لیے ہر دم بیقرار رہتی ہیں۔اسی تڑپ نے انہیں کشمیر کے مظلوم مہاجروں کی مدد کے لئے ہمہ تن وقف کر دیا،ان کے دکھ درد میں شریک رہیں۔کشمیر کی یادوں کی مہک،جو دل ودماغ میں رچی بسی ہے،اب اسی کے سہارے زندگی بسر کر رہی ہے۔ادب کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتی ہے۔[۵]

بیگم محمودہ بشیر اور ان کے شوہر احمد بشیر کی زندگی کا دوسرا حصّہ پاکستانی ادب سے ملتا ہے۔احمد بشیر (۱۹۲۳) کے والد شیخ غلام احمد کا تبادلہ بطور ہیڈ ماسٹر کشمیر ہوا تھا اور احمد بشیر نے جموں وکشمیر یونیورسٹی کی جموں شاخ سے بی اے کا امتحان پاس کیا تھا۔پھر وہ ہجرت کرکے جہلم میں اپنے ماموں شیخ اشفاق حسین کے پاس رہنے لگے۔ان کی دوسری شادی ۱۹۴۸ء میں محمودہ بیگم سے ہوئی اور ان کے بطن سے چار بیٹیاں اور ایک بیٹا پیدا ہوئے ۔پاکستانی ادب میں احمد بشیر کی تصانیف'' جو ملے تھے راستے میں''(خاکے)،خون جگر ہونے تک (مضامین)،دل بھٹکے گا(ناول)،خطوط میں جوشِ بو(مکاتیب) اور خون کی لکیر (ناول) شامل ہیں۔دوسری طرف محمودہ بیگم کی کتاب ''دو تحریریں'' اور '' میں اور احمد بشیر'' کا بھی ذکر ملتا ہے۔اب سوال پیدا ہوتا ہے کیا کشمیر میں پلی بڑھی بیگم محمودہ بشیر اور پاکستان کی ادیبہ محمودہ بیگم ایک ہی شخصیت کا نام ہے؟اس اُلجھن کو دور کرنے کی خاطر ہم نے متعدد پاکستانی مشاہیر سے رابطہ کیا تھا لیکن بدقسمتی سے کسی نے جواب نہیں دیا۔اب اُمید ہے کہ اگر یہ مضمون کسی نامور رسالے میں شائع ہوگیا،تو یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو جائے گا۔عرفان جاوید نے اپنی کتاب ''دروازے'' میں احمد بشیر اور محمودہ کی آپسی محبت کے حوالے سے لکھا ہے:

ذہین اور نکتہ رس،احمد بشیر بعد میں شادی کرتا ہے اور چار بیٹیوں اور ایک بیٹے کا باپ بنتا ہے۔اپنی بیوی سے مثالی محبت کرتا ہے اور بیٹیوں کو بیٹوں کی طرح پالتا ہے۔ایک کو شہزادی کہتا ہے،تو

۵۔حبیب کیفوی،کشمیر میں اردو،مرکزی اردو بورڈ گلبرگ لاہور،اپریل ۱۹۷۹،ص:۱۵۳

دوسری کو رانی۔ بیٹیوں کو دیکھ کر آنکھ میں نرمی اور پیار ہی پیار ہوتا ہے۔[۶]

محمودہ بشیر نے قیامِ کشمیر کے دوران ہی قصے کہانیوں کا آغاز کیا تھا۔ ان کے چار ناولوں کا ذکر ملتا ہے جن میں ''سرتل، کندن بھائی، چاند گرہن (۱۹۷۸ء) اور چھٹ گئے بادل (۱۹۸۸ء)'' شامل ہیں۔ ''چاند گرہن'' اور ''چھٹ گئے بادل'' دراصل ایک ہی ناول ہے صرف نام الگ الگ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پہلے اس کا نام ''چاند گرہن'' رکھا گیا تھا اور دوسری اشاعت کے وقت ۱۹۸۸ء میں اس کا نام ''چھٹ گئے بادل'' رکھ دیا ہے۔ یہ ایک فیملی ڈراما ہے اور اس میں شہناز مرکزی کردار کے طور پر نظر آتی ہے۔ شہناز کی شادی تین بار ٹوٹ جانے کے سبب وہ نہ صرف ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے بلکہ ہر کسی سے کہتی پھرتی ہے کہ میری تقدیر پر چاند گرہن کا سایا ہے۔ لیکن دس سال بعد وہ اس ناول کا نام ''بادل چھٹ گئے'' رکھتی ہے کیونکہ ناول کے آخری باب میں ڈاکٹر ہاشم اور شاعر حبیب کی حکمت عملی سے شہناز کی زندگی سے صحیح معنوں میں نحوست اور گرہن کے بادل چھٹ جاتے ہیں۔ انسان ہر حال میں مصیبتوں کا سامنا کرتا ہے اور اس کو اچھے کی اُمید رکھنی چاہیے، یہی اس ناول کا مرکزی خیال ہے۔ اس ناول کے ذریعہ یہ اچھا پیغام دیا گیا ہے کہ ذہنی طور سے متاثر لوگوں کی دیکھ بھال کس طرح پیار، ہمدردی اور نزاکت سے کرنی چاہیے۔ ناول میں رومانیت، اخلاقیات، مذہبیت، سماجیات اور اصلاح کے نمونے ملتے ہیں۔

(۴) زینت فردوس زینت

زینتؔ کا تعلق سرینگر کے مگرمل باغ علاقے سے ہے۔ ان کا ایک ناول ''نئی سحر'' کے نام سے ہے، جو ۱۹۷۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اب یہ ناول نایاب ہے۔ جموں و کشمیر میں ناول نگاری پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں نے ان کا نام رسمی طور پر لیا ہے اور ان کی حیات، خدمات اور ناول نگاری پر کوئی بحث نہیں کی ہے۔

(۵) ترنم ریاض: (۱۹۶۳-۲۰۲۱)

ترنم ریاض کی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۷۵ء میں ۱۲ سال کی عمر میں ہوا۔ وہ ریاست کی سب سے اہم اور معتبر ناول نگار تسلیم کی جاتی ہیں۔ ان کے ناولوں کی ادبی اہمیت و معیار، تاریخی حیثیت، کردار نگاری اور جذبات نگاری کا ہی نتیجہ ہے کہ عالمی سطح کے ناقدین تک ان کے ناولوں کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی نے ناول ''برف آشنا پرندے'' کا تجزیہ یوں کیا ہے:

۶۔ عرفان جاوید، دروازے، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۸، ص: ۱۹۸

ترنم ریاض کا تازہ ترین ناول ''برف آشنا پرندے'' اپنے زمانی و مکانی تناظر کی حد تک خطہ کشمیر کے لازوال حسن، اس کی زخم خوردہ روح، قوت تحمل، ماضی کی خوابیدہ گزر گاہوں اور حال میں زندگی کے اُفق پر نئی تاب و تپش اور معنویت پر مبنی ایک نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ناول کا نام بظاہر اپنی ایک علامتی رمزیت کے باوجود معاشرتی حقیقت نگاری کے واضح میلان کا نمائندہ اور پریم چند کی قائم کردہ فکشن کی روایت کی ایک توسیع شدہ نئی حسیت اور شعور وآگہی کا حامل تجربہ ہونے کے سبب اپنی جانب خصوصیت کے ساتھ متوجہ کرتا ہے۔[۷]

ان کا پہلا ناول ''مورتی'' ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ ازدواجی زندگی کی ناکامی اور اس کے اسباب پر ایک اہم ناول ہے۔ جس کی ہیروئن ملیحہ کے اندر کا فن کار آہستہ آہستہ کمزور اور بے حس ہو جاتا ہے۔اور زندگی اس کے لئے محرومی میں بدل جاتی ہے اور یہ محرومی عصر حاضر میں ہر عورت کی تقدیر معلوم ہوتی ہے۔ مورتی صحیح معنوں میں ملیحہ جیسی اُن تمام خواتین کی علامت ہے جن کے پاس ہنر واستعداد ہونے کے باوجود مرد کی کم ظرفی کے سبب صلاحیتیں ظاہر نہیں ہو پاتیں۔اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر مشتاق احمد وانی نے لکھا:

ناولٹ ''مورتی'' کشمیر ہی نہیں بلکہ برصغیر کی اہم فکشن نگار خاتون ڈاکٹر ترنم ریاض کا تراشا ہوا شہ پارہ ہے۔اس ناولٹ کا زماں اگرچہ عصرِ رواں ہے لیکن اس کا مکاں کشمیر سے دہلی اور دہلی سے سعودی عربیہ تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ ناولٹ فن، فنکار، قدردانِ فن اور ناقدردانِ فن کے چوکھٹے میں جنس، احساسات اور جذبات کی ایک دنیا سمائے ہوئے ہے۔۔اس ناولٹ کی ایک اہم جہت تانیثیت کی بھی ہے۔ یہ مرد پر قائم معاشرے کے اُس چلن کے خلاف خاموش احتجاج بھی ہے جہاں عورت کے جذبات اور احساسات کو بے وقعت گردانا جاتا ہے۔اس ناولٹ کا خوبصورت ترین پہلو اس کا بیانیہ ہے۔۔زبان وبیان کی چاشنی، تہذیب وثقافت پر مصنفہ کی گہری نظر اور فن کی باریکیوں کے شعور نے اس ناولٹ کی اثر پذیری میں چار چاند لگائے ہیں۔[۸]

ناول ''برف آشنا پرندے'' (۲۰۰۹ء) میں کشمیر کی تہذیب وتمدن، تاریخ، معاشرت، منظر نگاری کا ذکر خوبصورتی سے کیا گیا ہے۔ اس کو ناقدین نے اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا کامیاب ناول قرار دیا ہے۔شائستہ فاخری نے اس کو کشمیر کی موجودہ صورت حال کے خلاف ایک احتجاجی ناول قرار دیا[۹]۔ جبکہ

۷۔ڈاکٹر مشتاق احمد وانی، تنقیدی فکر وفن، میزان پبلشرز، سرینگر، ۲۰۲۱، ص:۹۹

۸۔شیرازہ، ہم عصر ناولٹ نمبر، جموں وکشمیر اکیڈمی آف آرٹ کلچر اینڈ لینگویجز، سرینگر، جلد ۵۴، شمارہ:1-3، ص:25-28

۹۔شائستہ فاخری، فکر وتحقیق، ہندوپاک :خواتین ناول نگار، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ، نئی دہلی، اپریل۔مئی

ڈاکٹر لیاقت علی نے لکھا ہے:

ترنم ریاض نے اس ناول میں کشمیر کی پانچ ہزار سالہ تاریخ کو سمیٹ کر کشمیر کی سماجی، معاشرتی اور ثقافتی زندگی کو پیش کیا ہے۔ ناول کشمیر کی سماجی تاریخ پر مبنی ہے۔ مصنفہ نے کشمیر کی صدیوں کی تاریخ کئی صفحات پر بیان کی ہے جس میں کشمیر کی شناخت، کشمیری افراد کے مصائب، کشمیر کی قدرتی خوبصورتی، کشمیر کے پکوان وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔[۱۰]

اس ناول کے سبب ترنم ریاض کو بجا طور پر کشمیر کی قرۃ العین حیدر کہا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شہناز قادری نے ''برف آشنا پرندے'' کو چارلس ڈکنس کے ''اے ٹیل آف ٹو سٹیز'' اور ڈیوڈ کاپر فیلڈ، ڈپٹی نذیر احمد کے ''ابن الوقت''، مرزا ہادی رسوا کے ''امراو جان ادا'' اور شمس الرحمٰن فاروقی کے ''کئی چاند تھے سرِآسمان'' کے زمرے میں رکھا ہے کیونکہ یہ تمام ناول اپنے عہد کے سماج میں ہونے والی تبدیلیوں، وہاں کے حالات وواقعات اور وہاں کی اچھائیوں اور برائیوں کا عکس پیش کرتے ہیں۔[۱۱]

''فریب خطۂ گل'' (۲۰۰۹) میں ترنم ریاض کے چار ناولٹ ''مورتی، مرا رختِ سفر آنسو، یمبرزل اور ماں صاحب'' شامل ہیں۔ ناولٹ ''میرا رخت سفر آنسو'' مصنفہ کے مطابق ایک سچے واقعے پر مبنی کہانی ہے۔ اس میں سماجی اور اصلاحی ناولوں کے نقوش بھی ملتے ہیں اس کا انداز کچھ قرۃ العین حیدر کے افسانہ ''فوٹو گرافر'' سے ملتا ہے۔ ناول ''مورتی'' اور ''میرا رخت سفر آنسو'' یوں مماثلت نظر آتی ہے کہ ان دونوں میں عورتوں کے جنسی ونفسیاتی استحصال کی مکمل ترجمانی نظر آتی ہے۔

ترنم ریاض کا ناولٹ ''یمبرزل'' ایک علامتی ناولٹ ہے وہ اُن تمام نوجوانوں کی علامت ہے جو جوانی میں موت کا جام پیتے ہیں۔ اس میں کشمیر کے حالات وواقعات کی سچی تصویر سامنے آتی ہے۔ اگرچہ ترنم نے کشمیر کی تاریخ کا بھی خاکہ پیش کیا ہے کہ کشمیریوں نے ہر دور اور ہر حکومت میں ظلم وستم برداشت کیے ہیں لیکن کشمیری کلچر کے ارکان کانگڑی، قالین، نون چائے، سفیدہ کے درخت، یمبرزل کے پھول، جھیل ڈل، چار چناری، شکارے، پری محل وغیرہ کے ذکر نے اس کو الگ کشمیری شان دے دی۔ چونکہ اس ناول کی ہیروئن ''نکی'' کو شاعرہ دکھایا گیا ہے، اس وجہ سے جگہ جگہ ترنم ریاض نے اشعار شامل کیے ہیں اور اس سے ناول میں ایک نیا انداز پیدا ہوا ہے۔

۲۰۱۶، ص: ۱۶۶

۱۰۔ ڈاکٹر لیاقت علی، جموں وکشمیر میں اردو ادب (۲۰۰۰ سے ۲۰۱۳ تک)، ایم آر پبلیکیشنز، نئی دہلی، ۲۰۱۷، ص: ۴۴

۱۱۔ مجلہ ہماری آواز، شعبہ اردو، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ، مضمون: نئی صدی میں اردو ناول جموں وکشمیر کے حوالے، ڈاکٹر شہناز قادری، ۲۰۲۱، ص: ۵۴

اردو فکشن نگاری میں ماں کی قدر وقیمت اور ماں کی بے قدری کے بارے میں متعدد افسانے اور درجنوں ناول ملتے ہیں، لیکن ترنم ریاض کے ناولٹ ''ماں صاحب'' کا موضوع ماں کی ممتا، ماں کی قدر وقیمت، ماں کے قدموں تلے جنت اور ماں کی بے قدری کی بجائے ماں کی خود غرضی ہے۔اس ناول میں ماں صاحب کو پنجابن دکھایا گیا ہے لہٰذا جگہ جگہ پنجابی الفاظ ملتے جاتے ہیں۔اس ناولٹ کی راونڈ کردار شگوفہ ہے، جو وقت کے ساتھ ساتھ بدلتی ہے اور ناول کے آخری حصّے میں ماں صاحب کی قربانیوں کا خیال کرکے اس کا زبردست احترام کرتی ہے۔تانیثی شعور کی بات کریں تو شگوفہ کی زبانی عورتوں کی بے قدری یوں بیان کی ہے:

کبھی ماں صاحب بھی چھوٹی سی لڑکی ہوں گی۔ پھر بڑی ہو گئیں اور بدلتی گئیں۔ جیسے لڑکیاں بدل جاتی ہیں، بدل دی جاتی ہے۔ بدلتے حالات انہیں بدل دیتے ہیں۔ [۱۳]

ترنم کے ناولوں کے موضوعات میں رنگارنگی ہے اور کردار بھی اپنے حرکات وسکنات سے متحرک نظر آتے ہیں۔زبان وبیان کی بات کریں تو ترنم شاعرہ بھی ہیں اور الفاظ کی نوک پلک سنوارنا بخوبی جانتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں زبان کی روانی، الفاظ کی دُرستگی اور اسلوب کی سادگی میں کوئی حرف نہیں آتا ہے۔اکیسویں صدی میں تانیثی تحریک شدومد سے آگے بڑھ رہی ہے اور ہندوپاک کی خواتین فکشن نگاروں کے ساتھ ترنم کا موازنہ کیا جائے تو بہت حد تک ترنم نے ان کو ہر لحاظ سے ٹکر دی ہے۔ان کی فکشن تحریروں کا ہی اثر ہے کہ ہندوپاک کی خواتین ناول نگاروں میں ان کا نام بڑے ادب واحترام سے لیا جاتا ہے۔

(۶) نعیمہ مہجور (۱۹۵۵)

نعیمہ مہجور کی صحافتی زندگی ریڈیو کشمیر سے بی بی سی اردو تک پھیلی ہوئی ہے۔یوں تو ان کے سیاسی وسماجی، مذہبی واقتصادی، نسائی وادب اطفال کے موضوع پر مضامین اور افسانے مسلسل دیکھنے کو ملتے ہیں۔ لیکن ان کا سب سے اہم کارنامہ ان کا سوانحی وتاریخی ناول ''دہشت زادی'' ہے۔اس میں کشمیر کی حقیقی کہانی پیش گئی ہے، اسی لئے اس کی پذیرائی عالمی سطح پر ہوئی۔ نعیمہ مہجور لکھتی ہیں:

دہشت زادی اُس کشمیری خاتون کی داستان ہے جو اپنے کیریر کے آغاز پر اُس وقت پُر تشدد حالات کے شکنجے میں پھنس گئی جب وادی کشمیر میں سنہ اسی (۸۰) کے اواخر میں حصولِ آزادی کی خاطر عسکری تحریک شروع ہو گئی اور ہر طرف قتل وغارت گری، تباہی اور بربادی کے نتیجے میں اُسے

۱۳۔ حوالہ سابق، ص: ۲۲۹

اپنے گھر، نوکری اور شوہر پر اختیار نہیں رہا۔ [۱۴]

اس میں کشمیر کی تاریخ کے اہم واقعات کو کمال کی حقیقت نگاری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ سچ کو بیان کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی ہے اور اہلِ کشمیر کو ڈر اور خوف کے ماحول سے باہر نکلنے کی تلقین کی گئی ہے۔ اس ناول کے اہم کرداروں میں طاہرہ، بابا، سعیدیہ، محمودہ، حفیظ، فائزہ، سائرہ، رشمی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ کشمیر میں ہونے والی خونی جھڑپوں اور لوگوں کے غائب ہونے کا بھی ذکر ہے۔

اس ناول میں کچھ اہم سوالات اُٹھائے گئے ہیں۔ مثلاً شیخ عبد اللہ کو ۱۹۵۳ء میں بھارت کے ساتھ الحاق کرنے کے باوجود گرفتار کیوں کیا گیا؟ اسی طرح میر واعظ کشمیر مولوی فاروق کے بیٹے کی اصل وصیت بھی درج ہے کہ ''جب کشمیر آزاد ہو جائے تو میری قبر پر آکر مجھے ضرور بتا دینا تاکہ میری روح کو سکون ملے''۔ اس میں بیٹیوں کو تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ دینے کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اس ناول میں آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ ناول کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھ کر نہیں لکھا گیا ہے بلکہ یہ ناول کشمیر کے مظلوم و مفلس، بے کار و بے یار و مددگار لوگوں کے درمیان میں رہ کر لکھا گیا ہے۔ اس ناول کے بارے میں کشور ناہید لکھتی ہیں:

> محمود ہاشمی اور قدرت اللہ شہاب کے بعد کشمیر کے بارے میں کوئی تحقیقی مقالہ یا تخلیقی ناول نہیں لکھا گیا۔ نعیمہ احمد مہجور نے نہ صرف موجودہ صورت حال کو ناول کے قالب میں ڈھالا ہے بلکہ مجھے وہ ساری حکایتیں اور داستانیں یاد کرا رہی ہیں جو فلسطینی، جنوبی افریقہ اور جنوبی امریکہ میں سامراجیت کے خلاف ناول اور نظمیں لکھی گئیں ہیں۔۔۔ نعیمہ کا اندازِ تحریر بہت سادہ مگر پُرکار اور پُروقار ہے۔۔۔ شاید نعیمہ کے ناول کو پڑھ کر حکمرانوں کی ذہنیت بدل جائے اور پردے کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے اس پر مزید تحریروں کی صورت میں پردہ اُٹھ جائے۔ [۱۵]

(۷) ڈاکٹر رخسانہ تبسم (۱۹۶۴)

عصر حاضر میں کشمیری زبان کی معلمہ ڈاکٹر رخسانہ تبسم کشمیری زبان کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی طبع آزمائی کر رہی ہیں۔ ان کا ناول ''خواب حقیقت'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس ناول کے تعارفی کلمات میں فاروق ریزو نے لکھا ہے:

> ڈاکٹر رخسانہ تبسم کا ناول ''خواب حقیقت''، سرزمین کشمیر کی زرخیز مٹی سے پیدا ہونے والے اُن خوبصورت پھولوں سے پروئی مالاؤں کی نہ ٹوٹنے والی کڑی ہے، جو کبھی ڈاکٹر سر محمد اقبال کے

۱۴۔ نعیمہ مہجور، دہشت زادی، میزان پبلشرز سرینگر، ۲۰۱۲، (فلیپ سے)

۱۵۔ حوالہ سابق،، ص: ۱۴

تخیل کی مہک میں کھل رہی تھی اور کبھی شیخ نورالدین نورانیؒ کے نور میں چمک رہی تھی۔[16]

صناعؔ کے کردار کے بارے میں فاروق زینز وشاہ نے لکھا:

ناول ''خواب حقیقت'' نہ صرف صناع کے مضبوط کردار کے محور میں گھوم رہا ہے بلکہ اس ناول نے سماج میں موجود اُن چہروں کو بے نقاب کیا ہے جو حکومت کی بے بسی کا فائدہ اٹھا کر اپنی تجوریاں بھر رہے ہیں۔ جنہوں نے سڑکوں پر ناجائز قبضے جمائے، جنہوں نے کشمیر کی خوبصورتی کو برباد کرنے میں اپنا بھرپور کردار نبھایا، جو غریب کو روندنا جانتے ہیں، کسی بے سہارے کا سہارا نہیں بن سکتے۔ اس ناول میں وہ چلتی پھرتی بسیں بھی نظر آرہی ہیں جہاں صرف چند پیسوں کی لالچ کے لئے انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح لادا جاتا ہے۔ اس ناول میں پولیس کے وہ آفیسر بھی نظر آتے ہیں جنہیں یہ نہیں معلوم کہ سماج کو کیسے صاف ستھرا بنایا جائے۔[17]

ڈاکٹر رخسانہ تبسم کے اس ناول کی بدولت کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک سنجیدہ مزاج ناول نگار ہیں۔ ان کے قلم میں زرخیزی بھی ہے اور الفاظ میں تاثیر بھی۔ انہوں نے سماجی، معاشرتی، سیاسی اور تانیثی مسائل پر بخوبی قلم اٹھایا ہے۔

(۸) رافیعہ رسول مغموم (۱۹۸۵)

رافیعہ کی ولادت ڈلگیٹ سرینگر سے متصل گاؤں بچھوارہ میں ہوئی۔ رافیعہ روزنامہ آفتاب میں بطور کارٹونسٹ خدمات انجام دے رہی ہے۔ اردو ادب میں ان کی پہچان ان کے سماجی و معاشی مسائل پر لکھے ناول ''پہچان آنسو کی'' کے سبب ہے۔ اس کا بنیادی موضوع کینسر جیسی مہلک بیماری ہے۔ رافیعہ کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کی موت بہت قریب سے دیکھی ہے اور وہ کینسر جیسی مہلک بیماری کے شکار ہوئے تھے۔ اس ناول کے لئے ڈاکٹر فرید پربتی نے ''حرف چند'' میں رافیعہ کو ترنم ریاض کے بعد کشمیر کی دوسری بڑی ناول نگار قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

رافیعہ رسول، ترنم ریاض کے بعد جموں و کشمیر کی دوسری ناول نگار ہے جس نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ناول کی صنف میں آزمایا ہے۔۔ رافیعہ رسول ناول کے فن سے حتی الوسع واقفیت رکھتی ہیں۔ ان کا ناول پلاٹ، کردار، جزئیات نگاری اور اسلوب کے اعتبار سے کامیاب ناول ہے۔ اس کا پلاٹ اگرچہ عام واقعے سے بُنا گیا ہے البتہ پلاٹ کے ساتھ جو

۱۶۔ ڈاکٹر رخسانہ تبسم، خواب حقیقت، ہورایزن پبلشنگ ہاوس، حضرت بل سرینگر، ۲۰۰۱، ص: I

۱۷۔ حوالہ سابق، ص: ۱۱

ٹریٹمنٹ (Treatment) ملتا ہے اس نے اس میں نہ صرف جان ڈالی ہے بلکہ لائقِ توجہ بھی بنادیا ہے۔اس ناول کی زبان موجودہ ناول کی طرح سادہ اور پُر لطف ہے۔اس میں البتہ کرداروں کے حسبِ حال زبان خلق کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔اس ناول کے کردار اگرچہ خواتین اور حضرات دونوں ہیں البتہ اس میں خواتین کے کردار کو زیادہ دلکش بنانے اور اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔اس طرح اس میں بھی ایک طرح سے مرد اساس معاشرے کے خلاف دبا دبا ہی سہی،احتجاج ضرور ملتا ہے۔[18]

ڈاکٹر فرید پربتی کی اس رائے سے مطلق اتفاق مشکل ہے تاہم مصنفہ کی صلاحیت تسلیم کرنے میں کوئی اختلاف نہیں۔اس ناول میں جگہ جگہ کشمیر کے قدرتی مناظر،رسم ورواج،تہذیب وتمدن،کشمیر کے مسائل جیسے موسم سرما کی سردی،بجلی کی آنکھ مچولی،کشمیری شال کی اہمیت،بخاری کی گرمی،جھرنوں کا شور،پرندوں کا چہچہانا،کھیتوں کا لہلہانا،کشمیریوں کی کسمپرسی اور بے بسی کا خوب ذکر ملتا ہے۔

اس مختصر جائزے سے یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ جموں وکشمیر میں مرد ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ خواتین ناول نگار بھی اپنی بساط کے مطابق اس فن میں اپنی موجودگی اور اہمیت درج کرانے میں کامیاب ہیں۔ان خواتین کے ناولوں کا موضوعاتی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ اکثر ناول سوانحی یا تاریخی نوعیت کے ہیں لیکن کشمیری نژاد خاتون ناول نگار رضیہ بٹ کے بیشتر ناول کرداری اور تانیثی نوعیت کے ہیں اور تمام ناول حقیقت کے قریب اور اصلاحی نوعیت کے ہیں۔

۱۸۔رافیعہ رسول مغموم،پہچان آنسو کی،ناشر:رافیعہ رسول مغموم،۲۰۰۹،ص:1

ملی مسائل

مسلم نوجوانوں کے تئیں ہماری ذمے داریاں

ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں

پچھلے بیس سالوں میں دنیا بہت بدل گئی ہے۔ معلومات کا ایک طوفان ہے جس میں خس و خاشاک سب بھرا ہوا ہے۔ اس کا شکار بالعموم نوجوان ہو رہے ہیں جن کے پاس وقت ہے، اسمارٹ فون اور لیپ ٹاپ کی صورت میں ٹکنالوجی کی سہولت ہے اور اپنے دین و تہذیب و ثقافت سے دوری کی وجہ سے وہ کسی بھی بہکاوے میں آسانی سے آجاتے ہیں۔ مسلم نوجوان چونکہ علم دین اور گھر سے وراثت میں ملی ہوئی ثقافت سے آج بڑی حد تک محروم ہیں اس لئے وہ اس معلوماتی طوفان سے بڑی آسانی سے متاثر ہو جاتے ہیں، خصوصاً جب یہ باتیں دین، اسلام، اسلام خطرے میں ہے اور دشمنوں کی سازش وغیرہ کے حوالے سے کہی جاتی ہیں۔

اسکول اور کالج کو تو مذہب و ثقافت سے کاٹ ہی دیا گیا ہے، اب گھروں میں بھی وہ تربیت نہیں مل رہی ہے جو پہلے کسی خاص کوشش کے بغیر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی تھی۔ اس صورتحال کا دشمنان اسلام فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ کوئی مسلم نوجوان کو الحاد سکھا رہا ہے تو کوئی اسے مقامی بت پرست تہذیب کی طرف کھینچ رہا ہے تو کوئی اسے اسلام کے ایک متشدد ایڈیشن کی طرف بلا رہا ہے جس کے تار القاعدہ، داعش اور حزب التحریر وغیرہ سے جڑے ہوئے ہیں۔ جو نوجوان اس سے متاثر نہیں ہوتے ہیں وہ بھی قوم سے کٹ کر صرف اپنے کیریئر کے بارے میں سوچتے ہیں جیسے اپنی امت سے بلکہ اپنے خاندان سے بھی ان کا کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ ایسی حالت میں مسلم نوجوانوں کو ایک روشن خیال اور معتدل مذہبی فکر کی طرف بلانا امت کے قائدین کا فریضہ ہے۔

نظام تعلیم کا بگاڑ ہمارا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ تعلیم کو دینی اور دنیاوی خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے جو کسی طرح اسلام اور اسلامی تاریخ سے میل نہیں کھاتا ہے۔ آج ہمارے مدرسوں کے فارغین اور کالجوں سے نکلنے والے نوجوانوں میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ وہ مل کر کام نہیں کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کا احترام نہ کرنے کی وجہ سے ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ اگر دونوں کے منہج تعلیم اور مواد تعلیم میں کچھ بنیادی قدر مشترک ہوتی تو یہ دوری نہیں پیدا ہوتی، یعنی اگر مدارس میں پڑھنے والے عصری علوم بھی پڑھتے اور اسکولوں میں پڑھنے والے اسلامیات سے بھی کما حقہ واقف ہوتے تو یہ مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔

ہندوستان کے تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم نوجوانوں کو تعلیم، کیریئر اور امت کے مسائل سے مثبت طور پر جوڑنے کے بارے میں کوئی خاص کام نہیں ہو رہا ہے۔ ایک طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ مدرسوں میں کچھ بچوں کو تعلیم دلا کر ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ یہ سوچ غلط ہے۔ علم دین کے ساتھ ساتھ عصری علم اتنا ہی ضروری ہے، ورنہ ہمارے مدارس کے فارغین زمانے کو اور اس کے مسائل کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے اور قیادت کا حق ادا نہیں کر سکیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وقت آگیا ہے کہ مدرسوں میں علوم دینیہ کے ساتھ ساتھ عصری تعلیم بھی پڑھائی جائے اور طلبہ کو ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانات دلوائے جائیں تاکہ جب وہ مدرسوں سے باہر آئیں تو مستقبل ان کے سامنے تاریک نہ ہو بلکہ وہ ان سارے مواقع سے فائدہ اٹھا سکیں جو ہمارا ملک اور موجودہ زمانہ ان کو فراہم کراتا ہے۔ اسی طرح مسلم عصری اسکولوں میں دین اور اسلامی ثقافت کی خاطر خواہ تعلیم ہونی چاہئے۔ اگر بچے مسلم عصری اسکولوں میں نہیں پڑھ رہے ہیں تو گھر پر والدین خود یا ٹیوٹر کے ذریعے یہ فریضہ انجام دیں ورنہ ان کے بچے تعلیم تو ضرور حاصل کر لیں گے، لیکن وہ اپنی قوم بلکہ خود والدین کے کسی کام کے نہ ہوں گے۔

مسلم قیادت کو اپنی صفوں میں وسعت پیدا کرنی ہوگی اور نوجوانوں کو بھی اپنی تنظیموں میں جگہ دینی ہوگی۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ صرف ۶۰-۷۰ کی عمر کے لوگ قیادت کے اہل سمجھے جائیں۔ آج مغربی دنیا میں ایک انقلاب آگیا ہے اور ۳۰-۴۰ سال کے لوگ بڑے بڑے مناصب پر فائز ہو رہے ہیں بلکہ وزرائے اعظم اور صدور جمہوریہ بن رہے ہیں۔ چند سال پہلے برطانیہ کے ۵۴ سالہ وزیر خارجہ نے یہ کہہ کر استعفا دیدیا تھا کہ میرے ساتھی سمجھتے ہیں کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ ہم کو چاہئے کہ نوجوانوں کو اپنی تنظیموں اور اداروں میں جگہ دیں اور کل کے لئے ان کی تربیت کریں۔ ان کے جوش اور انرجی سے فائدہ اٹھائیں اور ان کو قیادت کے رول کے لئے تیار کریں، ورنہ شاید وہ دن دور نہیں جب نوجوان ہمارے ہاتھ سے نکل جائیں گے اور تلاش کرنے پر بھی باصلاحیت لوگ نہیں ملیں گے۔ مجھے لگتا ہے کہ شاید یہ زمانہ شروع ہو چکا ہے۔ اب ہماری تنظیموں اور اداروں میں ثانوی درجے کے لوگ آرہے ہیں جبکہ اول درجے کے لوگ یا تو ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں یا ملٹی نیشنل کمپنیوں اور حکومت کی ملازمتوں کی طرف راغب ہیں۔ اپنی امت کے لئے ان کے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کے لئے ہم بطور امت ذمے دار ہیں۔

ہماری قیادت کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ عصری اسلوب میں آج کی رائج زبانوں میں اسلام کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں لٹریچر مطبوعہ اور آنلائن صورت میں فراہم کرائیں تاکہ نوجوانوں کی صحیح فکری نشو و نما ہو سکے ورنہ وہ معلوماتی یلغار کا شکار ہو کر نہ صرف ہمارے ہاتھ سے جاتے رہیں گے بلکہ اپنی امت کے لئے مسئلہ بھی بنیں گے۔ آج یہ مسئلہ شروع ہو چکا ہے۔ کوئی الحاد کا شکار ہے تو کوئی ہندوتوا کے

فلسفے سے متاثر ہے اور کوئی داعش اور القاعدہ کے گمراہ افکار کو صحیح اسلام سمجھتا ہے جس کی وجہ سے پوری امت کی بدنامی ہوتی ہے۔

ہماری موجودہ مسلم قیادت بھی نوجوانوں کے لئے ماڈل نہیں بن رہی ہے۔ ذاتی زندگی میں زہد و تقوی کی پابندی اور مواطن شک وریبت سے بچنا، حالات کے آگے فوراً سر نہ جھکانا بلکہ ان کا مقابلہ کرنا اور ان کو تبدیل کرنا ہماری قیادت کا شیوہ ہونا چاہئے۔افسوس ہے آج ہم یہ نمونہ نہیں پیش کر رہے ہیں۔اور اس کا اثر لازمی طور پر ہمارے نوجوانوں پر پڑ رہا ہے۔ کوئی ناامیدی کا شکار ہو رہا ہے تو کوئی امت سے کٹنے میں عافیت سمجھ رہا ہے۔ کوئی ''جہاد'' کے نام پر فساد برپا کر کے بزعم خود اسلام کی خدمت کر رہا ہے۔

نوجوانوں کے مسائل کو سمجھنا، ان کو حل کرنا اور نوجوانوں کو امت کے مسائل میں شریک کرنا ایک دینی فریضہ ہے، جس سے غفلت کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ اگر ہم نے اس ذمے داری کو صحیح طریقے سے نہیں نبھایا تو ہمارے نوجوان ہمارے لئے بڑا مسئلہ بن سکتے ہیں۔ آج ہم اپنے نوجوانوں کو صرف والنٹیر اور بھیڑ کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان کو قیادت میں شریک کے طور سے دیکھیں۔ آج کا نوجوان کل کا قائد ہے۔ اگر وہ قیادت کے لئے صحیح معنوں میں تیار نہیں ہو رہا ہے تو آنے والے کل میں مسلمانان ہند یا تو صالح قیادت سے محروم ہوں گے یا انھیں ایسی قیادت ملے گی جو انھیں تباہی کی طرف لے جائے گی۔ اگر آج کا نوجوان اپنی امت کے ساتھ، اپنی قیادت کے ساتھ اور مسلم تنظیموں کے ساتھ نہیں جڑا ہے تو اس کے لئے ہم بوڑھے لوگ ذمہ دار ہیں۔ جتنی جلدی اس غلط روش اور انداز کہنہ کی اصلاح کر لی جائے اتنا ہی اچھا ہے۔

اخبار علمیہ

گوگل ٹرانسلیٹ میں ۲۴ نئی زبانوں کی شمولیت

ایک خبر کے مطابق گوگل نے اپنے ٹرانسلیٹ فارم میں تین کروڑ سے زاید لوگوں کے ذریعہ بولی جانے والی ۲۴ زبانوں کو شامل کیا ہے۔ان میں افریقہ میں بولی جانے دس نئی زبانیں لینگالا،ٹووی،ٹگرینیا،سمیت متعدد زبانیں ہیں۔زبان کی رکاوٹوں کو دور کرنے اور دنیا بھر کے لوگوں کو جوڑنے میں مدد کرنے کی اپنی پالیسی کو مد نظر رکھتے ہوئے اب ان زبانوں کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتی ہے جو ٹکنالوجی میں زیادہ اثر نہیں رکھتیں۔ان میں شمالی ہندوستان میں بولی جانے والی بھوجپوری شامل ہے۔تقریباً پانچ کروڑ لوگ اس کو بولتے ہیں۔نیپالی اور فجی وغیرہ بھی اس میں شامل ہیں۔(اخبار مشرق، نئی دہلی ۳، مئی ۲۰۲۲ء ص ۴)

برموڈا ٹرائی اینگل، معمہ کو حل کرنے کا دعویٰ

اس نام سے بحر اوقیانوس کا ایک خطہ موسوم ہے جس کا ایک حصہ برموڈا، دوسرا ٹوریکو اور تیسرا فلوریڈا سے متصل ہے۔ان تینوں کونوں کے درمیانی حصہ کو برموڈا تکون یا مثلث کہا جاتا ہے۔یہ سمندر کے اندر ایک ایسا پراسرار علاقہ ہے جہاں اب تک بہت سے طیارے، کشتیاں اور جہاز غائب ہو چکے ہیں اور ان کا کوئی سراغ آج تک نہیں مل سکا اور یہ اب تک معمہ بنا ہوا تھا۔تاہم اب آسٹریلیا کے سائنس دانوں نے اس کو حل کرنے کا دعویٰ کیا ہے۔سڈنی یونیورسٹی کے کارل کروزیلنکی کا کہنا ہے کہ برموڈا ٹرائی اینگل میں طیاروں اور کشتیوں کی پراسرار گمشدگی کے پیچھے مافوق الفطرت وجوہات نہیں ہیں۔ان کا خیال ہے کہ یہ واقعات ممکنہ طور پر موسم کی خرابی اور انسانی غلطی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ یہ علاقہ خط استوا کے قریب ہے۔اس لئے یہاں بہت ٹریفک ہے۔کارل نے اپنے نظریہ میں فلائٹ ۱۹ کا بھی ذکر کیا ہے جو ان تمام گمشدگیوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے۔کارل کا خیال ہے کہ فلائٹ ۱۹ اس دن بحر اوقیانوس میں ۱۵ میٹر کی بلند لہروں کی وجہ سے غائب ہوئی اور پرواز میں واحد تجربہ کار پائلٹ لیفٹیننٹ چارلس ٹیکر تھا جس کی انسانی غلطی اس سانحہ کا سبب بنی ہوگی۔(انقلاب، وارانسی ۱۲، ۵، ۲۰۲۲ء ص ۱۱)

خشک سالی سے متاثر ممالک پر ایک رپورٹ

اقوام متحدہ کے کنونشن برائے انسداد بنجرپن (یو این سی سی ڈی) کی جانب سے جاری کردہ ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ گذشتہ صدی کے دوران خشک سالی سے سب سے زیادہ ایشیائی ممالک کے باشندے متاثر ہوئے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق جن ممالک کو خشک سالی کی ہنگامی صورت حال کا سامنا ہے ان میں افغانستان، انگولا، برازیل، برکینیا فاسو، چلی، ایتھوپیا، ایران، عراق، کینیا، لسیوتھو، مالی، موریطانیہ، مڈگاسکر،

ملاوی، موزمبیق، صومالیہ، جنوبی سوڈان، شام، پاکستان، امریکہ اور زیمبیا شامل ہیں۔ نتائج اور خطرات کی پیشین گوئی کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ۲۰۵۰ء تک ۴۰ لاکھ مربع کلو میٹر اضافی قدرتی علاقوں (جو کہ بھارت اور پاکستان کے حجم کے برابر ہیں) کو بحالی کے اقدامات کی ضرورت ہوگی۔ رپورٹ میں حیاتی تنوع، پانی کے ضابطے، مٹی اور کاربن کے ذخیرے کے تحفظ اور ماحولیاتی نظام میں بہتری کے لئے اقدامات اور وسائل فراہم کرنے کی جانب فوری توجہ دلائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ زمین کی ۴۰ فیصد آبادی تباہی کا شکار ہے۔ جس سے براہ راست انسانی آبادی کا نصف حصہ متاثر ہے ہی ساتھ ہی ساتھ ۴۴ کھرب ڈالرز کی عالمی معیشت کو بھی خطرہ کا سامنا ہے۔ اگر یہی صورت حال باقی رہی تو ۲۰۵۰ء تک امریکہ کے رقبہ کے برابر علاقہ مزید تباہ ہو سکتا ہے۔ ۲۰۳۰ء تک تباہی کا شکار ایک ارب ہیکٹیر کی بحالی کے لئے رواں دہائی میں ۱.۶ ٹریلین ڈالر کی ضرورت ہے جو آج کے سالانہ ۷ کھرب ڈالرز کی فوسل اور زرعی سبسڈی کا ایک حصہ ہے۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جدید تاریخ میں اب تک انسانیت کو ایسے خطرات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ (صحافی دکن، حیدر آباد، ۱۶؍ ۵؍ ۲۰۲۲ء ص ۴)

پھانسی کی شرح میں اضافہ

ایران ہیومن رائٹس اور ٹو گیدر اگینسٹ دی ڈیتھ پنلٹی نامی دو غیر سرکاری تنظیموں نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ ایران جوہری پروگرام پر مذاکرات کے ذریعہ بین الاقوامی میدان میں مضبوط واپسی کا آغاز کر رہا ہے، لیکن ساتھ ہی سزائے موت پر عمل درآمد بھی جاری ہے اور مخالفین کو دبانے کے لئے اس کو ایک حربہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق سال ۲۰۲۱ء میں پھانسی کی سزا میں ۲۵ فیصد اور سزا یافتہ خواتین کی تعداد میں نمایاں اضافہ ریکارڈ ہوا ہے۔ ۲۰۲۰ء میں ایران میں ۲۶۷ ملزمین کو پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔ دونوں تنظیموں نے انکشاف کیا کہ گذشتہ جون میں ابراہیم الرئیسی کے صدر منتخب ہونے کے بعد پھانسی کی سزا میں تیزی آئی ہے اور ۲۰۲۱ء کی دوسری ششماہی میں پہلی ششماہی کے مقابلہ میں پھانسی کی سزا میں دوگنا اضافہ ہوا ہے۔ سو سے زائد صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۲۰۲۰ء میں ۹ خواتین جب کہ ۲۰۲۱ء میں دو کم عمر لڑکیوں سمیت ۱۷؍ خواتین کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ دونوں تنظیموں کے مطابق منشیات اسمگلنگ معاملہ میں ایک سال کے دوران ۱۲۶ کو سزائے موت دی گئی۔ سال ۲۰۲۰ء میں یہ تعداد ۱۰۰ تک محدود تھی۔ دونوں تنظیموں نے عالمی برادری سے اپیل کی ہے کہ وہ ایران کے ساتھ مذاکرات میں سزائے موت کے معاملہ کو ترجیحاً شامل کریں۔ ان تنظیموں کی جانب سے اپیلیں تو اس وقت بھی کی جانی چاہئیں جب قوت و اقتدار اور مفادات کی جنگ میں معصوموں اور بے گناہوں پر آسمانوں سے خطرناک بموں سے آگ برسائی جاتی ہے۔ (اعتماد، حیدر آباد، ۳۰؍ اپریل ۲۰۲۲ء ص ۷) (ک۔ ص اصلاحی)

تبصرۂ کتب

سوانح حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ: از مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، مجلد صفحات ۵۳۶، قیمت: ۳۵۰روپے، پتہ ابراہیم بک ڈپو، مدرسہ ضیاءالعلوم، رائے بریلی،۲۲۹۰۰۱ یو.پی، ندوہ کے تمام مکتبے اور مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ، سنہ طباعت ۲۰۱۹ء، موبائل نمبر: ۹۹۱۹۳۳۱۲۹۵
www.abulhasanalinadwi.org

تکیہ رائے بریلی کے سلسلہ علماء و مشائخ میں ایک نہایت قابل احترام نام مولانا محمد ثانی حسنی کا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کا انتقال قریب ستاون سال کی عمر میں ہوا۔ زمانہ طالب علمی کے بعد ان کی تمام زندگی صرف دین، علم اور اصلاح معاشرہ کی فکر اور خدمت لوح و قلم میں گزری۔ ان کے تحریری کمالات کا اعتراف کم کیا گیا ورنہ حقیقت یہی ہے کہ وہ نہایت کامیاب سوانح نگار اور بلند پایہ مصنف تھے۔ ماہنامہ رضوان کے ذریعہ ان کی بامقصد اور پاکیزہ تحریروں کو فروغ عام حاصل ہوا، وہ نہایت خوش گو اور پر گو شاعر بھی تھے۔ لیکن یہ سارے کمالات ایک طرف اور ان کی داعیانہ فکر، دردمندی اور مسلسل جدوجہد ان کی زندگی کا اصل حاصل ہے۔ تکیہ کی فضا کیا کم تھی کہ شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلوی کی تربیت اور مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی رفاقت نے ان کی صلاحیتوں کو اور بھی بابرکت بنادیا۔ ماحول اور تعلیم و تربیت کے اس خاص نہج نے ان کو ایک ایسے انسان کے سانچے میں ڈھال دیا جو صرف محبت، غم خواری، خیر خواہی، نرم مزاجی اور شفقت و عنایت کا ایک ایسا مجسمہ بن گیا جس کے لئے صرف لفظ ہر دلعزیزی زیب دیتا ہے۔ ایسی شخصیت کے کارناموں کو یاد کرنا اور یاد کرانا اس لئے بھی ضروری ہے کہ آج امت کو ایسی ہی تقلید کے لائق شخصیتوں کی ضرورت ہے جن کے حالات سے کچھ بننے اور پانے کا جذبہ یقیناً پیدا ہوتا اور پروان چڑھتا ہے۔ مولانا ثانی حسنی کی سوانح نگاری کے بارے میں مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی نے خوب لکھا ہے کہ "اس فن میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ سوانحی عناصر کی شیرازہ بندی کے فن سے وہ خوب واقف تھے"۔ ایسے سوانح نگار کی سوانح نگاری بجا طور پر اپنا تقاضہ رکھتی تھی۔ اس تقاضہ کو پورا کرنے کی سعادت و عزت ان کے نواسے کی قسمت میں تھی جو اس سے پہلے کئی علما اور بزرگوں کے حالات بڑے سلیقے سے سپرد قلم کرتے رہے ہیں۔ لائق سوانح نگار کی اس کتاب میں محض معلومات ہی نہیں، دل کی کیفیات بھی ہیں جن سے تاثیر و تاثر کی الگ شان ظاہر ہوتی ہے۔ ایک جگہ لکھا گیا کہ لکھنؤ کی ایک مجلس میں مولانا محمد عمران خاں ازہری بھوپالی نے اپنے مخصوص انداز گفتگو میں ندوی اور بدوی کی بات کی، جس کو سن کر کسی رفیق نے مولانا ثانی مرحوم سے پوچھا کہ آپ کیا ہیں؟ ندوی یا بدوی! انہوں نے جواب دیا میں تو فدوی ہوں، مولانا ابو بکر حسنی نے اس پر تبصرہ کیا کہ سچی بات یہی کہ فدویت ان کے جسم و روح میں جاری و ساری تھی، دیکھا جائے تو اس کتاب میں بس یہی ایک رنگ سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ (ع۔ص)

اخلاق فاضلہ اور اس کی تحصیل کے اصول و قواعد: ڈاکٹر عبداللہ بن ضیف اللہ رحیلی، مترجم مولانا عبدالقدوس نیر انوی، مولانا عبداللہ بستوی، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۸۶، ملنے کا پتہ: دارالمعارف الٰہ آبادی، ۶۳۹ وصی آباد یو.پی قیمت: ۱۱۰ روپئے، سال اشاعت ۲۰۱۹ء۔

زیر تبصرہ کتاب شیخ عبدالفتاح ابو غدہ کے شاگرد اور استاد حدیث جامعہ طیبہ، مدینہ منورہ ڈاکٹر عبداللہ بن ضیف اللہ الرحیلی کی ۱۴۲۹ھ میں شائع شدہ کتاب الاخلاق الفاضلہ قواعد و منطلقات لاکتسابھا کا ترجمہ ہے۔ حدیث و سیرت اور آثار صحابہ مصنف کا خاص موضوع اور ان کے مطالعہ و تحقیق کا سارا سرمایہ یہی ہے۔ اسلوب داعیانہ، بحث مدلل اور معلومات مستند و محقق ہیں۔ اچھے اخلاق میں فرق و تمیز کے لئے شریعت کو معیار بنایا گیا ہے۔ مصنف کی محنت، اخلاص، غیر جانب دارانہ مطالعہ کی وجہ سے غالباً اس کتاب کو حسن قبول حاصل ہوا۔ کئی ممالک میں شائع ہوئی اور کئی یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں داخل ہے۔ متعدد زبانوں انگریزی، ترکی اور چائنیز میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اردو ترجمہ اس لئے بھی خاص ہے کہ مصنف نے اس کو دیکھا کیا ہے اور اس میں اصلاح بھی کی ہے۔ (ص ۹) پورے مواد کو سات فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی فصل کو چھوڑ کر ہر فصل میں متعدد عناوین کے تحت، بحثیں ہیں۔ پہلی فصل میں اخلاق کا تعارف، اخلاق کی تعریف وغیرہ، دوسری میں کتاب و سنت میں اخلاق کے اصول و قواعد، اخلاق کی بنیادوں اور اصولوں کی ترجمان آیات و احادیث، تیسری میں تحصیل اخلاق کے بنیادی اصول و ضوابط، چوتھی میں اخلاق کی تقسیم اور ہر قسم کی اہمیت، پانچویں میں اخلاق کی بابت اقوال پر ایک نظر، اخلاق حمیدہ کی تحصیل کے طریقہ اور اس کے میدانوں پر ایک نظر وغیرہ، چھٹی میں انسانی تصرفات میں ذوق و ادب وغیرہ، ساتویں میں مخالفین کے ساتھ برتاؤ میں اخلاق وغیرہ جیسے جلی عنوانات کے تحت مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ آخر میں آیات و احادیث، آثار صحابہ اور مصادر و مآخذ کی فہرست دی گئی ہے۔ اخلاق فاضلہ پر اس درجہ مبسوط بحث عموماً کم ملتی ہے۔ غرض اپنے موضوع پر گویا یہ انسائیکلوپیڈیا ہے۔ موجودہ عہد میں اخلاقیات کے زوال نے ممکن ہے ایسی عمدہ کتاب لکھنے کی تحریک کی ہو۔ مصنف نے دیدہ ریزی میں کمی نہیں کی اور مترجموں نے بھی ترجمانی کا حق بخوبی ادا کیا۔ کتاب کے مفید ہونے کے لئے اتنا کافی ہے کہ مولانا قمر الزماں الٰہ آبادی صاحب جیسے عالم و فاضل مصنف خود اس کا ترجمہ کرنے والے تھے۔ مصروفیات کی وجہ سے یہ خدمت لائق مترجمین کے سپرد کی اور رہنمائی کرتے رہے۔ ترجمہ میں زبان سلیس اور عام فہم استعمال کی گئی ہے۔ بالخصوص قرآنی آیات و احادیث اور عربی اشعار کے ترجمہ میں یہ خوبی عام طور پر نظر آتی ہے۔ البتہ بعض مقامات پر مبہم اور غیر واضح ترجمہ مثلاً ''ہم اخلاقی انانیت کی خطرناکی کو اس طرح سمجھ لیتے ہیں'' (ص ۱۵۴) وغیرہ کے سبب اس ترجمہ کو ان بلند پایہ معیاری مترجمہ کتابوں کی صف میں رکھنے میں تامل ہو سکتا ہے جن کے متعلق ''ترجمہ پر اصل تصنیف کا گمان'' ہونے کی بات کہی جاتی ہے۔

مسجد کی مرکزیت اور ابدیت شریعت کی روشنی میں: محمد ساجد صحرائی، کاغذ و طباعت عمدہ، غیر مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۳۳۶، ملنے کا پتہ: نیو کریسنٹ پبلیشنگ کمپنی، ۲۰۳۵ قاسم جان اسٹریٹ، دہلی، قیمت ۲۴۰ روپے، سنہ طباعت ۲۰۱۸ء، موبائل نمبر: ۹۹۹۷۵۰۳۴۷

مذہب اسلام میں مسجد کو جو بنیادی اہمیت و مرکزیت حاصل ہے۔ وہ محتاج بیان نہیں۔ مسلمانوں کی آبادی کی شناخت مسجد کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی۔ مسجد جہاں ایک بار بن گئی پھر وہ خطہ ہمیشہ کے لئے خاص ہوگیا۔ موجودہ دور کے فتنوں اور مصائب میں غیر اسلامی طاقتوں نے مسجد کی اسی اہمیت کو دیکھتے ہوئے مسجدوں کی شکست و ریخت کو اپنی دشمنی کا وسیلۂ اظہار بنا رکھا ہے۔ کچھ نافہم یا مفاد پرست نام نہاد مسلمان کبھی کبھی مسجد کی زمین کی ابدیت پر سوال اٹھا کر کسی اور جگہ اس کی منتقلی یا اس سے دست برداری کی بات کرتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں ایسے تمام معاملات پر علما و فقہا اور مفتیان کرام کی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے جن میں نہایت تحقیق اور مستند طریقہ سے اصل معاملہ کی وضاحت کی گئی ہے اور یہ اتفاق کیا گیا ہے کہ مسجد سے کسی بھی صورت میں دست برداری صحیح نہیں ہے۔ مرتب نے شروع میں مساجد کے موجودہ قضیوں کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے اور ان کے بقول انہوں نے اس موضوع پر سیر حاصل مواد اس لئے فراہم کیا ہے تاکہ مسجد کی ابدیت و مرکزیت پر سوال اٹھانے والوں کا جواب امت کے پاس مرتب شکل میں موجود ہو (ص ۷) کتاب میں کل گیارہ مقالات ہیں جو ملک کے مختلف مکاتب فکر کے نامور علما اور دانشوروں کے قلم سے ہیں۔ پروفیسر مولانا امیر الدین مہر کے دو مقالات عظمت مساجد: قرآن کی روشنی میں اور مساجد کے خلاف سازشیں، اسلام میں مساجد کی اہمیت، مفتی ظہیر الدین مصباحی، مولانا خالد سیف اللہ کے دو مقالات مساجد کی شرعی حیثیت اور مسجدیں اور حنبلی نقطۂ نظر کی وضاحت کے عنوان سے شامل ہیں۔ دین میں مسجد کی اہمیت، مولانا عبدالعلیم اصلاحی، اوقاف و مساجد کی زمین کا شرعی حکم، علامہ یٰسین اختر مصباحی، مسجد کا تبادلہ یا اس کی منتقلی نہیں ہوسکتی، مفتی نظام الدین رضوی مصباحی، مسجد کی منتقلی اور اس کا بیچنا جائز نہیں، مولانا ابرار احمد ندوی، مسجد کی شرعی حیثیت، ڈاکٹر مفتی نادر احمد قاسمی، قضیہ بابری مسجد اور شریعت اسلامی، مفتی صلاح الدین ملک، ہندوستان اور مساجد کے موضوع پر مولانا عطاء الرحمن قاسمی صاحب کے مقالات ہیں۔ تقریباً ہر مقالہ اپنے موضوع پر کافی و شافی مواد کا حامل اور لائق مطالعہ ہے۔ افسوس ہے اس میں شیعہ حضرات کی نمائندگی نہیں ہے۔ بعض تحریروں میں یکسانی ہے اور تکرار کا احساس بھی ہوتا ہے۔ مجموعی طور سے یہ کتاب اپنے موضوع پر بڑی کارآمد، پر از معلومات اور خاص و عام کے لئے مطالعے کے لائق ہے۔ (ک۔ ص اصلاحی)

ادبیات

نعت

رئیس احمد نعمانی

نعمانی منزل نزد: ابوہریرہ مسجد، ۴۰۷/۴، ج ۲۴ ہمدرد نگر۔ بی. جمال پور۔ علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲

بالیقیں جائیں گے جنّت میں وہ ایمان کے ساتھ
جن کو آقا ﷺ سے تعلق ہے دل و جان کے ساتھ

جن کو آقا ﷺ کی صداقت پہ یقیں ہوتا ہے
وہی ٹکراتے ہیں حالات کے طوفان کے ساتھ

ساری دنیا کے نوشتے سبھی منسوخ ہوئے
آپ ﷺ کو بھیجا جب اللہ نے قرآن کے ساتھ

قول سے، فعل سے آقا ﷺ کی غلامی ہو عیاں
اپنی عزت ہے جہاں میں اسی پہچان کے ساتھ

پوری تعلیم نبوت کا خلاصہ ہے یہی
جینا ہر حال میں توحید کے اعلان کے ساتھ

باعث فخر ہے آقا ﷺ کی غلامی ہم کو
ربط سمجھتے ہیں کسی صدر نہ سلطان کے ساتھ

دائیں اور بائیں ابو بکرؓ و عمرؓ، بیچ میں آپ ﷺ
حشر میں آئیں گے سرکار ﷺ عجب شان کے ساتھ

خون کے آنسو بھی اگر روئیں تو کم ہے، اُس پر
جو کیا باغیوں نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ

دے گیا حضرت حیدرؓ کو فریب، ابن سبا
تھی عداوت نہ مسلماں کو مسلمان کے ساتھ

جو تعلق تھا علیؓ ابن ابی طالب سے
تھا تعلق وہی سرکار ﷺ کو عثمانؓ کے ساتھ

اس کی امّت پہ، یہ یلغارِ ستم ہے، جس نے
ظلم رکھا نہیں جائز کسی حیوان کے ساتھ

ظالمو! جابرو! آنے ہی کو ہے روز حساب
کچھ دنوں اور اکڑ لو ابھی شیطان کے ساتھ

شہِ ابرار ﷺ کے مدّاحوں میں شامل ہے رئیس
خلد میں جائے گا وہ حضرتِ حسّانؓ کے ساتھ

معارف کی ڈاک

(۱)

نقل را عقل باید

آپ کے نام میرا یہ مکتوب نہ تو معارف میں چھپے کسی مضمون پر تبصرہ ہے اور نہ معارف کی پالیسی پر کوئی مشورہ۔ بلکہ ایک الگ نوعیت کے مسئلے کا اظہار ہے جس سے دارالمصنفین گذشتہ صدی کی اسّی کی دہائی میں ایک ادارے کے طور پر دوچار ہوا تھا جب اس کی شائع کردہ کتب، بالخصوص علامہ شبلی نعمانی کی سیرۃ النبی، پاکستانی ناشرین بلا اجازت چھاپ کر اپنی تجوریاں بھر رہے تھے اور بالواسطہ دارالمصنفین کو مالی نقصان پہنچا رہے تھے تو مرحوم صباح الدین عبدالرحمان نے پاکستان میں ذمہ دار اہل علم کو اس جانب متوجہ کیا اور انھیں خطوط لکھے کہ کس طرح دارالمصنفین کے حقوق پر پاکستان میں ڈاکہ ڈالا جارہا ہے اس کا سدّ باب کیا جائے۔ بعد میں ان کی کوششیں رنگ لائیں اور حکومت پاکستان نے نیشنل بک فاونڈیشن کے لیے دارالمصنفین سے حقوق خرید لیے۔ میرا مسئلہ اگرچہ انفرادی ہے لیکن اس کی ماہیت اور نوعیت ویسی ہی ہے۔ اس کے اظہار کے لیے مجھے معارف کے صفحات سے بہتر کوئی اور پلیٹ فارم نظر نہیں آیا۔ معارف کا انتخاب نہ صرف میرے معارف سے دیرینہ تعلق کی بنا پر ہے، بلکہ اس لیے بھی ہے کہ یہ موقر علمی مجلّہ ہندوستان کے اہل علم اور علمی اداروں کو جاتا ہے، شاید اس کے ذریعے پاکستان سے یہ آواز وہاں تک پہنچ جائے۔

حکیم حبیب الرحمان اخون زادہ ڈھاکا والے (۱۸۸۰ـ۱۹۴۷ء) کی تصنیف **ثلاثہ غسالہ** کا قلمی مسودہ، جو ڈھاکا یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے، اس کے جو اجزا مجھ تک پہنچ سکے انھیں میں نے اپنی علمی بضاعت کے مطابق مرتب کرکے، اس پر مقدمہ اور تعلیقات لکھ کر اور چند مددگار فہارس (اشاریے) لگاکر، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور سے مارچ ۱۹۹۵ میں چھپوایا تھا۔ یہ بنیادی طور پر کشف الظنون کی طرز پر بنگال (یا موجودہ بنگلادیش اور مغربی بنگال) میں تصنیف ہونے والی عربی، فارسی، اردو تصانیف کی کتابیات ہے جو اردو زبان میں تیار ہوئی ہے۔ حکیم صاحب نے کتابوں کے تعارف کے ضمن میں مصنفین کے مختصر حالات بھی درج کیے ہیں۔ یہ کتاب متحدہ بنگال کے مسلمان مصنفین کی علمی کاوشوں کے تعارف پر مبنی ایک مفید دستاویز ہے۔

اب اصل ماجرا یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے ۲۰۲۱ء میں ایک ہندوستانی دوست سے معلوم ہوا کہ میری ترتیب و تدوین کردہ ثلاثہ غسالہ کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی، کلکتہ نے ۲۰۲۰ء میں شائع کیا ہے۔ فطری طور پر سب سے پہلے میرے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے میری تحریری اجازت کے بغیر یہ کتاب اپنے طور پر کیسے شائع کردی؟! اگر بازاری ناشرین یہ حرکت کریں تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ

انھیں صدق معاملات سے کیا لینا دینا، انھیں پیسہ کمانا مقصود ہوتا ہے، لیکن ایک ایسا ادارہ جو حکومت مغربی بنگال ہند کے محکمہ اقلیتی امور و مدرسہ تعلیم کے نیچے ہے اور مغربی بنگال کی موجودہ وزیر اعلی آئینی لحاظ سے اس کی سربراہ ہیں، وہ یہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام کیسے کر سکتا ہے؟ اس سوال کا جواب تو اکاڈمی کا کوئی ذمہ دار ہی دے سکتا ہے۔ اکیڈمی کی ۲۰۲۰ میں سیکرٹری نزہت زینب صاحبہ نے کتاب پر اپنے دیباچے 'اپنی بات' میں یہ جملہ لکھ کر گویا اپنے گناہ کا کفارہ ادا کر دیا: "بنگال کے ادبیات پر کام کرنے والوں کو آسانی فراہم کرنے کے لیے مغربی بنگال اردو اکاڈمی اسے مغربی پاکستان اردو اکاڈمی کے شکریے کے ساتھ شائع کر رہی ہے۔" (ص۶)۔ مجھے نہیں معلوم مغربی بنگال اردو اکاڈمی نے مغربی پاکستان اردو اکیڈمی سے باقاعدہ اجازت لے کر یہ کتاب شائع کی اور شکریہ ادا کیا یا محض رسمی شکریہ ہے؟ خیر، مجھے اب یہ ایڈیشن دیکھنے کا اشتیاق اور اضطراب تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی سیکرٹری کتاب کا کم از کم ایک نسخہ مجھے بھیجتیں۔ کتاب پر میرا ڈاک کا پتا چھپا ہوا ہے وہ یہ کام کر سکتی تھیں لیکن ایسا نہیں ہوا! چنانچہ میں نے ڈاکٹر عطا خورشید صاحب (علی گڑھ) سے کہہ کر ایک نسخہ کلکتہ سے خرید وایا کہ مجھے ارسال کریں۔ لیکن ہندوستان اور پاکستان کے درمیان براہ راست ڈاک کا نظام معطل ہونے کے باعث، یہ نسخہ ڈاکٹر محمد اجمل الاصلاحی (دہلی) نے براستہ لندن ۱۱ مئی ۲۰۲۲ کو مجھ تک اسلام آباد پہنچایا۔ پہلی نظر میں یہ ایڈیشن دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ناشر نے نئی کمپوزنگ اور جدید صفحہ بندی کی ہے اور ضخامت ۴۸۵ صفحات ہو گئی ہے۔ (لاہور ایڈیشن معمولی دستی کتابت سے ۳۸۲ صفحات پر مشتمل ہے)۔ مواد و مضامین کی ترتیب اور شمولیت ہو بہو لاہور ایڈیشن والی ہے۔ لیکن ہندوستانی ناشر (مغربی بنگال اردو اکاڈمی) سے ایک ایسی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ میں اسے دیکھ کر سر پیٹ کر رہ گیا ہوں اور فارسی محاورہ یاد آگیا "نقل را عقل باید"، نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے نقل اڑا ہی لی تھی تو عقل بھی استعمال کر لی ہوتی۔ امر واقع یہ ہے کہ میں نے اپنی مرتبہ کتاب (لاہور ایڈیشن) میں فہرست عنوانات کتب، (ص ۴۳تا۶۳) متن (ص۱-۲۱۸) تعلیقات (ص ۲۱۹-۳۰۸)، اشاریہ مصنفین، مترجمین، شارحین، موضوعات، کتب و رسائل (ص ۳۰۹-۳۷۶) میں لاہور ایڈیشن کے صفحات نمبر کے مطابق حوالہ دیا ہے۔ کلکتہ ایڈیشن میں یہ تمام حوالے جوں کے توں ہیں حالانکہ کلکتہ ایڈیشن میں پوری کتاب کے صفحات نمبر بدل چکے ہیں۔ اس کی مثال یوں لیجیے کہ لاہور ایڈیشن میں 'تاریخ کشمیریان ڈھاکہ' کے لیے صفحات ۱۲۹، ۲۷۸ کی طرف رجوع دیا گیا ہے تو کلکتہ ایڈیشن میں بھی یہ ایسا ہی چھپا ہے جب کہ کلکتہ ایڈیشن کے صفحات ۱۲۹، ۲۷۸ پر تاریخ کشمیریان ڈھاکہ کا قطعاً ذکر نہیں ہے بلکہ صفحات ۲۰۷، ۳۴۷ پر ذکر ہے۔ دوسرے لفظوں میں کلکتہ ایڈیشن میں جہاں جہاں کسی کتاب یا مصنف کے نام کے آگے صفحہ نمبر کا حوالہ درج ہے وہ غلط ہے اور ان صفحات نمبر کی کتاب سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں ہے۔ اس طرح جو کتاب بقول سیکرٹری صاحبہ قاری کی آسانی کے لیے چھاپی گئی ہے اس

سے آسانی تو کجا، الٹا الجھن پیدا ہو گئی ہے کہ قاری اس کتاب کو کس صفحے پر تلاش کرے؟۔ خود اِس احقر مرتب کو مغربی بنگال اردو اکاڈمی سے بلا اجازت کتاب چھاپنے کی جو شکایت ہے سو ہے، اس پر مزید تکلیف دہ امر یہ ہے کلکتہ ایڈیشن میں صفحات نمبروں کی عدم مطابقت سے میرے کام کی سُبکی اور بے ترتیبی ظاہر ہوتی ہے۔ کلکتہ ایڈیشن کا قاری اسے مرتب کی کوتاہی پر ہی محمول کرے گا۔ بات صرف حوالہ نمبروں کی عدم مطابقت تک محدود نہیں ہے بلکہ کلکتہ ایڈیشن میں کتابت کی جو غلطیاں ہیں اس کے لیے الگ مضمون چاہیے۔ یہ تمام شاخسانہ کتاب کی اشاعت سے مرتب کو لاعلم اور الگ رکھنے کا ہے۔ اگر ناشر نے مجھ سے رابطہ کیا ہوتا اور اشاعت سے قبل مسودہ دکھایا ہوتا تو یہ پریشانی نہ ہوتی۔

میں اس خط کے توسط سے مغربی بنگال اردو اکاڈمی کلکتہ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر وہ کوئی ذمہ دار ادارہ ہے تو اولاً اس کتاب کے سرقہ ایڈیشن پر مرتب سے معافی مانگے، ثانیاً اس غیر علمی ایڈیشن کی تقسیم اور فروخت روک دے جو میری علمی بدنامی کا باعث ہے۔ میں اس ایڈیشن کی قطعاً کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا اور اس سے لاتعلقی ظاہر کرتا ہوں۔

اگر مغربی بنگال اردو اکاڈمی واقعی ثلاثہ غسالہ کی افادیت سے آگاہ ہے تو میں اس کتاب کا نظر ثانی شدہ ایڈیشن مرتب کر سکتا ہوں۔ کیونکہ لاہور اشاعت ۱۹۹۵ کے بعد سے اب تک اس موضوع پر میرے پاس مزید مواد جمع ہو چکا ہے جسے تعلیقات میں استعمال کر کے بہتر ایڈیشن سامنے لایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر عارف نوشاہی

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

naushahiarif@gmail.com

معارف: ہمیں مغربی بنگال اردو اکاڈمی کلکتہ کے ذمے داران سے توقع ہے کہ وہ اس غلطی کی تلافی کرتے ہوئے ڈاکٹر نوشاہی سے معذرت کریں گے، غلط اشاریہ، کتاب سے نکال کر نیا صحیح اشاریہ اس میں منسلک کریں گے اور اگلی اشاعت کے لئے ڈاکٹر نوشاہی سے ربط قائم کریں گے اور ان کو موجودہ اور اگلی دونوں اشاعتوں کا معقول معاوضہ بھی دیں گے (مدیر)۔

(۲)

مدیر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

معارف فروری ۲۰۲۲ء کے شمارے میں ڈاکٹر معین الدین شاہین کا مضمون ''پروفیسر ظفر احمد صدیقی'' نظر سے گزرا، چوں کہ یہ معارف جیسے وقیع علمی مجلے میں شائع ہوا ہے لہذا ضروری سمجھا گیا کہ اس مضمون میں واقع بعض تسامحات کی نشاندہی کر دی جائے۔

شاہین صاحب نے ظفر احمد صدیقی کی تاریخ ولادت ۱۰ار اگست ۱۹۵۰ عیسوی تحریر کی ہے۔ متداول تاریخ ۱۰ار اگست ۱۹۵۵ء ہے۔ ممکن ہے یہ کتابت کی غلطی ہو۔ اصل تاریخ ولادت جوان کی خاندانی ڈائری میں درج ہے: ۲۴ر جمادی الاول ۱۳۷۲ھ، ۹ر فروری ۱۹۵۳ء ہے۔ (ملاحظہ کریں: ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی مرحوم از قلم اہلیہ ڈاکٹر انوار احمد صدیقی، مشمولہ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ ۱۰ر فروری ۲۰۲۱ء)

تصانیف ظفر احمد صدیقی کی فہرست تعارف میں دیوان ناظم (مطبوعہ رامپور، ۲۰۱۱ء) کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ غلطی ''رشید حسن خاں و ظفر احمد صدیقی، مرتبہ ٹی. آر. رینا (دہلی ۲۰۱۲ء) میں شامل عزیزی عبدالرازق (تلمیذ ظفر احمد صدیقی) کے اشاریہ ظفر احمد صدیقی میں بھی آئی ہے۔ (ص: ۲۴۰) رضا لائبریری رامپور میں والیِ رامپور نواب یوسف علی خاں ناظم کے دیوان کا ایک مطلا و مذہب نسخہ مکتوبہ ۱۸۶۱ء موجود تھا۔ لائبریری نے اس گراں قدر نسخے کو اس کی تمام خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۲۰۱۱ء میں شائع کر دیا اور اس کی قیمت ۲۵۰۰ روپئے تجویز کی۔ اس نسخے پر مقدمہ پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے لکھا (مکتوبہ ۲۴ر نومبر ۲۰۰۹ء) جو ۱۸ر صفحات پر مشتمل ہے۔ دیوان ناظم کے سرورق پر تعارف و تقدیم کے تحت ظفر احمد صدیقی کے نام کا اندراج کیا گیا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ اسے ان کی مطبوعات میں شامل کر لیا گیا۔

شاہین صاحب نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شائع مونو گراف ''نظم طباطبائی'' کی دو اشاعتیں درج کی ہیں: ایک ۲۰۱۲ء میں دہلی سے اور دوسری ۲۰۱۳ء میں لاہور سے۔ دراصل یہ اشاعتیں ظفر صاحب کی مدونہ کتاب ''شرح دیوان غالب'' سے متعلق ہیں، جسے ہندوستان میں مکتبہ جامعہ دہلی نے ۲۰۱۲ء میں اور لاہور سے جناب تحسین فراقی نے ۲۰۱۳ء میں شائع کیا تھا۔

خط قدرے طویل ہو گیا، معذرت خواہ ہوں۔ امید کہ بخیر ہوں گے۔

مخلص

شمس بدایونی

علی گڑھ، ۱۹ر مئی ۲۰۲۲ء

Mob: 9837092245

email: drshamsbadauni@gmail.com

دارالمصنّفین کے لیل ونہار

سول سروس کوچنگ سینٹر کے قیام کے لئے میٹنگ

ہندوستان میں سول سروسز امتحانات کی اہمیت سے ہر شخص واقف ہے۔اس امتحان میں کامیاب ہونے کے لئے طلبہ کیسے تیاری کریں۔ مسلم طلبہ و طالبات کے اندر اس سلسلے میں کیسے بیداری پیدا کی جائے ؟ اعظم گڑھ میں ایسا کوئی سینٹر نہیں ہے۔ چنانچہ سول سروسز کوچنگ سینٹر کے قیام پر غور وخوض کرنے کے لئے دارالمصنفین شبلی اکیڈمی میں ایک میٹنگ منعقد کی گئی اور کوچنگ اور گائیڈنس سیل کے قیام کا اعلان کیا گیا۔اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لئے ایک ٹیم کی تشکیل بھی عمل میں آئی اور مختلف لوگوں کو مختلف ذمہ داریاں سونپی گئیں۔طے پایا کہ یہ ٹیم ناظم دارالمصنّفین ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں اور شہر کے مشہور معالج ڈاکٹر جاوید اختر کی سرپرستی اور پریاگ انسٹی ٹیوٹ،دہرہ دون (اتراکھنڈ) کے سربراہ رضوان احمد خان کی نگرانی میں کام کرے گی۔میٹنگ میں اسی سال آئندہ ماہ سے اسٹیٹ اور سینٹرل سول سروسز کی کوچنگ شروع کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔اس موقع پر نائب ناظم دارالمصنّفین ڈاکٹر فخرالاسلام صاحب، شبلی کالج کے متعدد اساتذہ اور شہر کے بعض ممتاز افراد موجود تھے۔

باغ شبلی میں انقلابی آم

دارالمصنّفین کی تاریخ کا ایک نہایت خوشگوار باب اس کی وہ تہذیب ہے جس کو آج عموماً گنگا جمنی تہذیب کا نام دیا جاتا ہے، برادران ملت ہوں یا برادران وطن ہر ایک کے لئے احترام، محبت اور جذباتی رواداری کے پاس و لحاظ کی ایسی مثالیں ہیں، جن کی وجہ سے اس ادارہ کو محبت اور عزت اور اعتبار کی دولت ایک صدی سے ملتی رہی ہے۔ایسا ہی ایک نمونہ چند دن پہلے سامنے آیا جب کمیونسٹ پارٹی کے ایک ممتاز رہنما جناب ہر مندر پانڈے پنجاب گئے۔ بھگت سنگھ کے گھر کی مٹی لے کر اعظم گڑھ کے کئی ممتاز اداروں میں ایسی شجرکاری کے لئے پہنچے جس کی جڑ میں بھگت سنگھ کے گھر کی مٹی شامل ہو۔ شبلی منزل کی محبت وعقیدت پانڈے جی کو شبلی منزل کے باغ تک لے آئی۔امرپالی آم کا ایک پودا انہوں نے اس کی نذر کیا۔اس موقع پر دارالمصنّفین کے احباب بھی موجود رہے۔اس آم کو شہید آم کا نام دیا گیا۔

(ادارہ)

رسید کتب موصولہ

البروفیسور السید ظل الرحمن وخدماتہ فی تطویر الطب العربی وعلومہ (عربی): د. فخر عالم الندوی، ابن سینا اکیڈمی، علی گڑھ۔ صفحات ۲۷۹۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۴۰۰ روپے

تنقید ریختی اور ادب میں اس کا مقام: ڈاکٹر خلیل احمد صدیقی مشیر، کتب خانہ انجمن ترقی ہند، ارو بازار، نزد جامع مسجد، دہلی، صفحات ۴۹۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت ۲۹۱ روپے

حرف واثر: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ صفحات ۲۶۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۴۵۰ روپے۔

ڈاکٹر شاہد اقبال قدر شناسوں کی نظر میں: ترتیب وپیشکش ڈاکٹر سید مسعود حسن، راعی بک ڈپو الہ آباد۔ صفحات ۱۸۴۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۲۸۰ روپے

رشید حسن خاں اور شمس بدایونی کا ادبی رشتہ: ڈاکٹر ٹی. آر. رینا، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، اے. ایم. یو. علی گڑھ۔ صفحات ۱۹۶۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۳۰۰ روپے

زندگی کے درخشاں نقوش (حیات مولانا محمد باقر حسین قاسمی): ترتیب مولانا محمد اسعد قاسمی و مولانا محمد اسجد قاسمی ندوی، مکتبہ ندویہ، لکھنؤ۔ صفحات ۵۲۷۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت ۷۰۰ روپے

سرکار شیخ العالمؒ اور حضرت سجادگان کا اجمالی تذکرہ: مولانا محمد انتخاب عالم صابری، چشتیہ بک ڈپو، ردولی شریف، صفحات ۳۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۶۰ روپے

شب چراغ: مرتب: جناب طہور منصوری نگاہ، کتابدار، ممبئی۔ صفحات ۳۹۲۔ سال اشاعت ۲۰۱۹ء قیمت: ۴۰۰ روپے۔

شبلی کے مکتوب الیہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ۔ صفحات ۲۰۸۔ سال اشاعت ۲۰۲۲ء قیمت ۳۵۰ روپے۔

شعرائے جنوبی مگدھ: ڈاکٹر آفتاب عالم، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۔ صفحات ۲۹۲۔ سال اشاعت ۲۰۲۱ء قیمت: ۳۰۰ روپے۔

مضمون نگاروں کے لئے اعلان

۱۔ مضمون صرف ورڈ MS Word پروگرام میں، جمیل نوری نستعلیق فانٹ، پوائنٹ ۱۴ میں بذریعہ ایمیل بھیجیں۔ایمیل کا پتہ: info@shibliacademy.org

۲۔ اگر مضمون مخطوطہ حالت میں دستی یا ڈاک سے بھیجا جارہا ہے تو براہ کرم کاغذ کے صرف ایک طرف اچھا حاشیہ چھوڑ کر لکھیں اور مضمون کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ ہر صفحے کے حوالہ جات اسی صفحے پر نیچے حاشیے پر نمبر وار لکھیں۔

۴۔ آسان اور عام فہم زبان استعمال کریں۔

۵۔ حوالے اس ترتیب سے ہوں: مصنف، کتاب کا نام، ناشر، جگہ، سال، جلد (اگر ایک سے زیادہ جلد ہو)، ایڈیشن (اگر طبع اول کے بعد کا ایڈیشن ہو)، صفحہ ؍ صفحات۔

۶۔ مضمون A4 سائز کے ۶۔۲۰ صفحات کے درمیان ہو اور ہر مضمون اپنی جگہ مکمل ہو۔

۷۔ معارف میں حتی الامکان سلسلہ وار مضامین نہیں شائع کئے جائیں گے۔

۸۔ معارف میں صرف غیر مطبوعہ مضامین و مقالات کو جگہ دی جائے گی۔ کہیں اور چھپنے کے لئے بھیجا گیا مضمون قابل قبول نہیں ہوگا۔

۹۔ نئے مضمون نگار اپنے مضامین کو معارف بھیجنے سے پہلے اپنے اساتذہ یا معتبر اہل علم کو دکھالیں۔

۱۰۔ نئے مضمون نگار اپنے مضمون کے ساتھ اپنی مختصر کوائف نیز پورا پتہ بشمول موبائل اور ایمیل پتہ بھی بھیجیں۔

۱۱۔ ہر مقالے کے ساتھ یہ وضاحت ہو کہ یہ مقالہ پہلے کہیں نہیں چھپا ہے اور اسے چھپنے کے لئے کہیں اور نہیں بھیجا جارہا ہے۔

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-	موازنہ انیس و دبیر	250/-
سیرۃ النبیؐ (خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2800/-	اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر	100/-
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-	سفر نامہ روم و مصر و شام	200/-
الفاروق	350/-	کلیات شبلی (اردو)	220/-
الغزالی	300/-	کلیات فارسی (فارسی)	--
المامون	175/-	مقالات شبلی اول (مذہبی)	170/-
سیرۃ النعمان	300/-	مقالات شبلی دوم (ادبی)	70/-
سوانح مولانا روم	220/-	مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	170/-
شعر العجم (اول)	250/-	مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	200/-
شعر العجم (دوم)	150/-	مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	150/-
شعر العجم (سوم)	125/-	مقالات شبلی ششم (تاریخی)	150/-
شعر العجم (چہارم)	200/-	مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	100/-
شعر العجم (پنجم)	150/-	مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	150/-
مکاتیب شبلی (اول)	150/-	الندوہ (۹ جلدیں)	4735/-
مکاتیب شبلی (دوم)	190/-	اسلام اور مستشرقین (چہارم)	250/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی (محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	350/-	الکلام	250/-
		علم الکلام	200/-
خطبات شبلی	150/-	انتخابات شبلی (سید سلیمان ندوی)	200/-

ISSN 0974-7346 Ma'arif (Urdu) Print **JUNE 2022** Vol. 209/6

RNI No. 13667/57 MA'ARIF AZM/NP-43/016

Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O. Box No: 19, Shibli Road, Azamgarh, 276001 U.P., India
Tel. 06386324437 Email: info@shibliacademy.org

دارالمصنفین کی چند اہم مطبوعات

سیرت عمر بن عبدالعزیز	مولانا عبدالسلام ندویؒ	100/-
مولانا الطاف حسین حالی کی یاد میں	پروفیسر اشتیاق احمد ظلی	250/-
مطالعات شبلی	،،،،	550/-
حیات سعدی	خواجہ الطاف حسین حالی	400/-
شبلی شناسی کے اولین نقوش	پروفیسر ظفر احمد صدیقی	600/-
شبلی کی آپ بیتی	مرتبہ: ڈاکٹر خالد ندیم	325/-
امام رازی	مولانا عبدالسلام ندویؒ	320/-
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	600/-
تذکرۃ المحدثین (اول)	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	200/-
تذکرۃ المحدثین (دوم)	،،،،	225/-
تذکرۃ المحدثین (سوم)	،،،،	300/-
محمد علی کی یاد میں	سید صباح الدین عبدالرحمنؒ	120/-
مولانا ابوالکلام آزاد	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	240/-
ابن رشد	محمد یونس فرنگی محلیؒ	330/-
تاریخ اسلام (اول و دوم مجلد)	شاہ معین الدین احمد ندویؒ	375/-
تاریخ اسلام (سوم و چہارم مجلد)	،،،،	500/-
تاریخ صقلیہ اول	سید ریاست علی ندویؒ	400/-
تاریخ صقلیہ دوم	،،،،	400/-
اسلام میں مذہبی رواداری	سید صباح الدین عبدالرحمن	250/-
یہود اور قرآن	مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ	150/-
تاریخ ارض القرآن	مولانا سید سلیمان ندویؒ	375/-